کتاب و سنّت اور اسلافِ اُمّت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ

اشرف الجرائد
حیدرآباد

Volume:17 Issue:9 September 2024

مُدیر

مولانا محمد عبدالقوی

ادارہ اشرف العلوم ٹرسٹ حیدرآباد

www.iauth.in

اشرف الجرائد میں شامل تمام مضامین کی تمام جزئیات سے مدیر کا اتفاق ضروری نہیں

آئینۂ مضامین

اشرف الجرائد کی توسیع واشاعت میں حصہ لے کر اشاعتِ دین کا ثواب حاصل فرمائیں۔ ادارہ

درسِ قرآن



سلام اس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے

از: مولانا محمد عبد القادر فرید قاسمی*

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ

(آل عمران:۱۵۹)

ترجمہ: ان واقعات کے بعد اللہ کی رحمت ہی تھی، جس کی بنا پر (اے پیغمبر) تم نے ان لوگوں سے نرمی کا برتاؤ کیا۔ اگر تم سخت مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے آس پاس سے ہٹ کر تتر بتر ہو جاتے۔

توضیح: نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی من جملہ خوبیوں اور کمالات میں نمایاں کمال وخوبی آپ کی نرم خوئی اور عفو ودرگزر تھی، اسی خوبی کی وجہ سے حضرات صحابہ کرامؓ پروانہ وار شمع محمدی کے ارد گرد جمع رہتے؛ بلکہ اس نورِ نبوت کے آگے جان نثار ہونے کے لیے بے تاب رہتے اور اس میں اپنی سرخروئی، سربلندی یقین کرتے، آیتِ شریفہ میں اللہ پاک آپ کے اس وصف خاص کا تذکرہ کرتے ہوئے کہہ رہا ہے، آپ کی نرم مزاجی، تلطف وترحم ہی ہے کہ لوگ متاثر ہو کر ایمان بھی قبول کر رہے ہیں اور جو ایمان لا چکے وہ اپنا دِل دے بیٹھے ہیں، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا تعارف صفتِ رحمت'' سے کروایا ہے:''انما بعثت رحمة''۔۔۔ ''انما انا رحمة مهداة'' مجھے اس دنیا میں سراپا رحمت بنا کر بطور انعام وتحفے کے بھیجا گیا ہے، ناقدروں کی طرف سے طرح طرح کی ایذائیں سہنے اور مسلسل سہنے کے بعد بھی زبانِ نبوت سے ہدایت اور کامیابی کی دعا کا نکلنا یہ وسعت ظرفی اور اپنی امت سے محبت نہیں تو اور کیا ہے؟ عذاب کے فرشتے عذاب کے لیے ایک اشارۂ چشم کے منتظر ہیں، باوجود یہ کہ جسم لہولہان، دندان مبارک شہید، پشت مبارک پر اوجھڑی، راہوں میں کانٹے، معاشرتی مقاطعہ، شہزادیوں کو طلاق، جلاوطنی طعنے، منصوبے، سازشیں، سحر، زہر وغیرہ۔۔۔ قربان جاؤں سینۂ نبوت میں دھڑکنے والے اس دل پر جو صرف

* ذمہ دار ادارہ حسیب المدارس، گھٹکیسر

گوشت کا لوتھڑا نہیں؛ بل کہ سمندروں جیسی وسعت، صحراؤں جیسی کشادگی رکھنے والا تھا، ایسے مواقع پر زبان مبارک سے نکلتا ہے ''انی لم ابعث لعانا و انما بعثت رحمة'' آگے امت پر کمال شفقت ورأفت یہ کہ ان جانی دشمنوں، اوباشوں، ناقدروں کے لیے بددعا تو کیا نکلتی بلکہ ان کی ھدایت کے لیے دست بدعا اور اپنی ہی ضعف قوت کی شکایت اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون ۔۔۔۔۔ اللھم الیک أشکوا ضعف قوتی و قلة حیلتی وھوانی علی الناس

صحابہ کرامؓ ــــ جن کی آنکھیں نبی پاک ﷺ کے شب و روز، اعمال و کردار کی دید اور انوارِ نبوت سے منور ہوئیں تھیں ــــ یوں منظر کشی کرتے ہیں کہ: ''آپ ﷺ ہشاش بشاش، خوش اخلاق و نرم خو تھے، تُند خو تھے نہ سخت دل، شور و شغب اور فحش گوئی سے دور تھے، اور عیب جوئی و بخل سے پرہیز کرتے تھے۔ نرم مزاجی عفو و درگزر یہ دونوں خوبیاں آپ ﷺ کی زندگی کا جز لاینفک بن چکی تھیں، مواقعِ انتقام اور قصاص پر بھی عموماً بڑی سنجیدگی، متانت کے ساتھ تلطف و ترحم کا معاملہ فرماتے تھے، نہ صرف معاف فرماتے؛ بل کہ اپنا دل بھی صاف فرمالیتے گویا ''فلیعفوا ولیصفحوا'' کی عملی تصویر تھے۔

سن آٹھ ہجری کی بات ہے غزوہ حنین سے واپسی پر ایک مقام پر قافلہ کو رُکنے کا حکم دیا، اذان دی گئی، وہیں مکہ مکرمہ کے کچھ شوخ مزاج لوگ موجود تھے، اذاں کی آواز سن کر تمسخر کرتے ہوئے نقل اُتارنے لگے، ان میں ایک جوان العمر ابومحذورہ کی آواز بڑی دلکش بن کر ابھر رہی تھی، آپ ﷺ نے انہیں بلوایا، کہا کہ ہمارے سامنے اذان دو، وہ کلمات اذان بڑی خوبصورت آواز کے ساتھ دُہراتے رہے، پھر آپ ﷺ نے ان کے سر پر دست شفقت پھیرا اور برکت کی دعا فرمائی۔ ادھر ابومحذورہ کے دل کی دنیا بدل چکی تھی، وہ آغوش اسلام میں آ گئے، آپ ﷺ نے انہیں کچھ چاندی کے تحفوں سے نوازا، پھر ان کی خواہش پر اُن کو حرمِ محترم کا مؤذن بنا دیا۔ بدوں کا بدویانہ پن جو بظاہر آدابِ نبوت کے بالکل خلاف ہوتا مزاجِ نبوت پر گراں نہ گزرتا، دیکھنے والے چراغ پا ہو جاتے؛ مگر آپ پیکرِ تحمل بنے بڑی طمانیت کے ساتھ ان کی بات سنتے، پوری بشاشت کے ساتھ جواب دیتے ۔۔۔۔۔ بعض یہودیوں کا متعصّبانہ رویہ اور بعضوں کے سخت لہجے محض اوصاف نبوت کو جانچنے کے لیے ہوتے، مگر جس زاویے سے آپ ﷺ کو آزمایا گیا ہر ایک میں آپ ﷺ کی ذات والاصفات کامل واکمل تھی، کبھی تیور میں تبدیلی، مزاج میں برہمی، طبیعت میں تند خوئی، چہرہ مبارک پر ناگواری، پیشانی پرنور پر نفرت کی سلوٹیں نہیں دیکھی گئیں تھیں، یہی تو آپ ﷺ کا کردار رہا، آپ ﷺ نے اپنے فرمودات سے بھی امت کو نرم خوئی و حسن گفتار کی تلقین فرمائی۔ انہیں اوصاف سے اسلام کا تعارف و تبلیغ ہوئی ہے آج اسی کی فقدان سے اسلام کی خوب رو شکل پر نفرتوں کی غبار آ گئی ہے۔

درسِ حدیث



اُٹھو کہ آج حق محبت ادا کریں

از: مولانا مفتی محمد احمد علی قاسمی*

عَنْ عَبدِ اللهِ بنِ مُغَفَّل ؓ، قَالَ: قَالَ رجلٌ لِلنَّبِيِّ ﷺ: يارسولَ الله! وَاللهِ اِنِّیْ لَاُحِبُّک، فَقَالَ: اُنْظُرْ مَاذَاتَقُوْل؟ قَالَ: وَاللهِ اِنِّیْ لَاُحِبُّک، فَقَالَ: اُنْظُرْ مَاذَاتَقُوْل؟ قال: وَاللهِ اِنِّیْ لَاُحِبُّک ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، فَقَالَ: اِنْ کُنْتَ تُحِبُّنِیْ فَاَعِدْ لِلْفَقْرِ تِجْفَافًا، فَاِنَّ الْفَقْرَ اَسرَعُ اِلٰی مَنْ یُحِبُّنِیْ مِنَ السَّیْلِ اِلٰی مُنْتَهَاهُ۔ (رواہ الترمذی: ۲۳۵۰)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: میں آپ سے محبت کرتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: دیکھ لو تم کیا کہہ رہے ہو؟ اس نے عرض کیا: قسم بہ خدا! میں آپ سے محبت کرتا ہوں، اس نے تین مرتبہ یہ بات کہی، آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم دعویٔ محبت میں سچے ہو تو پھر فقر و فاقہ کا مقابلہ کرنے کے لیے ڈھال تیار رکھو، کیوں کہ جو شخص مجھ سے محبت کرتا ہے تو فقر اتنی تیزی سے اس کی طرف جاتا ہے کہ اتنا تیز سیلاب کا پانی بھی اپنے بہاؤ کی طرف نہیں جاتا۔

تشریح: اُلفت وعقیدت، انسیت و یگانگت، محبت وتعلق اور چاہت و پیار ایسے الفاظ ہیں جو انسان کے دلی جذبات واحساسات کا اظہار کرتی ہیں، یہ اور ان جیسے بے شمار الفاظ وکلمات کا جامع ترین لفظ ''محبت'' ہے، جو دل کی اٹوٹ وابستگی اور والہانہ وارفتگی کا عکاس ہے، عشق ومحبت قوت قلب بھی ہے غذائے روح بھی، آنکھوں کی ٹھنڈک بھی ہے اور دلوں کا سرور بھی، زندگی کی علامت بھی ہے اور فطرت کا نشان بھی، اس کائناتِ رنگ وبو میں محبت وعقیدت کا تعلق خدائے ذوالجلال کے بعد اگر کسی ہستی کے ساتھ ممکن ہے تو وہ محبوب رب العالمین سیدنا مولانا محمد مصطفی احمد مجتبی صلوات اللہ وسلام علیہ افضل الصلوات والتسلیمات کی پاکیزہ پرنور وپربہار شخصیت ہے، نبی پاک ﷺ کی ذات اقدس کو خداوند قدوس نے مؤمنین کے جان ومال اور آل واولاد سے بھی بڑھ کر قرار دیا

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

ہے،اس لیے ایک مومن کے لیے کمال ایمان کے مقام پر فائز ہونے کی شرط ہر چیز کی محبت سے بڑھ کر ''حبِ رسول'' ہے ،عجیب بات ہے کہ اللہ رب العزت نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اطہر میں ایسے سارے ''اسباب محبت'' (حسن و جمال ،فضل وکمال ،اور احسان ونوال) کو بھی جمع کر دیا ہے ،جس کی وجہ سے کوئی بھی شخص کسی سے محبت وعشق کا تعلق رکھتا ہے۔

جسم ظاہر کے حسن و جمال کی طرف نظر کی جائے تو چاند ستاروں کی چمک دمک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک قدموں کی دھول دکھائی دے گی ،فضل وکمال میں اگر آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شخصیتِ عظمیٰ کو دیکھا جائے تو آپ کی مبارک ہستی اولین وآخرین کے علوم کی جامع نظر آئے گی ،قرابت واتصال پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ علیہ السلام کی اپنی امت کے تئیں فکر وکڑھن اور اضطراب وبے چینی پر سینکڑوں آیاتِ قرآنی شاہد ہیں ،احسان ونوال کا اگر جائزہ لیا جائے تو آپ علیہ السلام سے بڑھ کر داد ودہش اور حسن عطا وسخاوت میں کوئی دوسرا نظر آنا مشکل ہے۔

اس محسنِ اعظم نے کیا کیا نہ دیا انسانوں کو

بہ ہر حال یہ اور ان جیسے سارے اسباب محبت اور وجوہات عشق پر غور کیا جائے تو یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ آپ علیہ الصلاۃ والسلام کی مقدس ہستی میں وہ سب باتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں ،اس لیے حضور پاک علیہ الصلاۃ والسلام سے محبت عقل وفہم کا بھی تقاضا ہے اور ایمان کا بھی؛اس لیے ہر مومن کو''محبت رسول'' سے سرشار رہنا چاہیے،اور عموماً ہوتا بھی ایسا ہی ہے؛لیکن یہ بات بھی ہمیشہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ محبت بغیر اطاعت رسول کے اور اطاعت رسول بغیر محبت کے ناقص محضہ ہے،اس لیے جامعیت ومقبولیت کی شان یہی ہے کہ اگر ایک طرف حب رسول سے جسم کا انگ انگ سرشار ہو تو دوسری طرف سراپا اطاعت رسول کا مظہر ہو۔ذکر کردہ حدیث شریف میں دیکھیے کہ صحابی رسول حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے بار بار اظہار محبت فرمارہے ہیں ،متعدد دفعہ کے استفسار اور جواب کے بعد جو بات نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے بیان فرمائی ہے اس کا خلاصہ یہی ہے کہ اگر دعویٔ محبت میں سچے ہو تو پھر ایسی صورت میں راہ خدا میں پیش آنے والے ہر مجاہدے کو سہنے کے لیے تیار رہو،حدیث شریف کا یہ جملہ امت کو ایک عظیم پیغام دیتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلق ومحبت کا رشتہ ہونا کوئی آسان اور معمولی بات نہیں ہے،اس لیے ہمیں محض زبانی دعووں سے آگے بڑھ کر عملی میدان میں بھی کچھ کام کرنا پڑے گا،صفاتِ نبوی اور خلق محمدی سے اپنے آپ کو آراستہ کرنا پڑے گا،تب ہی ہماری محبت ''محبت صادقہ'' کہلائے گی جو انشاءاللہ دنیا اور آخرت میں نجات کا ذریعہ ثابت ہوگی۔اللہ پاک نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبتِ صادقہ عطا فرمائے آمین

دوسری قسط

پیش گفتار

مدارسِ دینیہ اسلامیہ سے

مقاصد ومطالبات کی روشنی میں چند گذارشیں

(۲)

از: مدیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ وبہٖ نستعین

(۳) مدرسۂ عالمیت:

ہر مدرسے میں عالمیت کا شعبہ نہیں ہوتا ہے، بالخصوص جنوبی ریاستوں میں اکثر مدارس صرف شعبۂ حفظ کی خدمات تک محدود ہیں، جہاں عالمیت کی تعلیم ہوتی ہے ان میں اکثر جگہوں پر دارالعلوم دیوبند کا نصاب ملحوظ رکھا جاتا ہے، بعض مدارس ندوۃ العلماء کے نصاب کو لے کر تدریسی نظام چلاتے ہیں، پھر ان نصابوں میں جزوی ردو بدل بھی مقامی تجربات کی روشنی میں کرلیا گیا ہے، بالخصوص صرف ونحو کے سلسلے میں، پھر بعض جگہ فارسی زبان کو باقی رکھا گیا تو بعض جگہ حذف کردیا گیا ہے۔

کئی مدارس میں عالمیت کا شعبہ طلبہ کی مناسب تعداد نہ ہونے کے باوجود چلایا جاتا ہے، اس سے معیارِ تعلیم متأثر ہوتا ہے، طلبہ حفظ کرنے کے بعد رکنے میں دلچسپی رکھتے ہوں اور ان کی تعداد قابل لحاظ ہو تو عالمیت کا سلسلہ شروع کرنا چاہیے ورنہ اُنہیں مناسب جگہ کا مشورہ دے کر کسی اچھے مدرسے میں بھیج دینا چاہیے، ایسا نہ کرکے محض اپنی خواہش کی وجہ سے طلبہ کو روکے رکھنے اور ان کے رکے رہنے کے لیے بے جا مراعات کرتے رہنے سے طلبہ کی تعلیم اور اخلاق دونوں کا نقصان ہوتا رہتا ہے، پھر یا تو وہ ترک تعلیم کردیتے ہیں یا پھر آگے کسی اور مدرسے میں جاتے ہیں تو استعداد ناقص ہونے کی وجہ سے مطلوبہ جماعت میں داخلہ نہیں ہوتا یا ہوتا ہے تو وہ چل نہیں پاتے، مایوس ہوجاتے ہیں اور بیتے دنوں کے نقصان پر اپنے مدرسے والوں سے بدگمان ہوجاتے ہیں، طلبہ پر ایسی زبردستی یقیناً ان کے ساتھ خیانت ہے۔

مدارسِ عالمیت کے سلسلے میں بھی تجربات کی روشنی میں چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

(الف) تدریس فنون:

نصاب کا ایک حصہ فنون پر مشتمل ہے جن میں سے اکثر فنونِ عربی زبان سیکھنے اور اس میں کمال پیدا کرنے سے متعلق ہیں، چند ایک مضمون حکمت و فلسفے کے نام سے موسوم ہیں۔ دراصل پہلے یہ معقولات و منقولات کی تقسیم تھی اور دونوں ہی کے لیے معتد بہ مواد ملحوظ رہا کرکرتا تھا، پھر دھیرے دھیرے معقولات نا کے درجے میں رہ گئے صرف عربی زبان اور منقولات کا حصہ برقرار ہے۔

جہاں تک عربی زبان کا مسئلہ ہے تو ظاہر ہے کہ ہم عجم ہیں اور ہماری علاقائی زبانیں سب عجمی ہیں جب کہ قرآن وحدیث کی زبان عربی بلکہ عربی مّبین ہے تو یقیناً پہلا کام اپنے بچوں کو عربی زبان میں اور وہ بھی عربی قدیم میں مہارت پیدا کرنا ہی ہوسکتا ہے اور ہونا چاہیئے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہیں لکھا ہے کہ ”جس عربی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابۂ کرام سے خطاب فرماتے تھے اور صحابہؓ آپ سے مخاطب ہوتے تھے اگر عالمِ دین اس عربی اور اس کے محاورات و معانی سے واقف نہیں ہوگا تو باوجود عربیُ اللسان ہونے کے بھی تحریفِ دین میں مبتلا ہوجائے گا، اس لیے کہ خود عرب قبائل بے شمار ہیں اور ہر قبیلے اور علاقے کی عربیت میں محاورات و استعارات علاحدہ ہیں، اس لیے زمانۂ نبوت میں اہلِ حجاز جو عربی بولتے تھے اس کا علم ہونا کتاب وسنت کے صحیح مفہوم تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔“

اس لیے مدارسِ عربیہ میں جدید عربی محادثہ و مکالمہ کو اصل نہ بنایا جائے بلکہ قرآن وحدیث کی زبان پیشِ نظر رکھ کر محنت کرائی جائے، یوں خارجی طور پر جدید عربی میں تحریر وتقریر کی مشق کرا لینا امر زائد ہے، ہوجائے تو اچھا ہی ہے، لیکن یہ بات ذمہ داروں کے اور طلبہ کی مدِنظر ضرور رہنا چاہیے کہ عربی زبان سیکھنے پر کم ازکم تین سال کا وقت جو لیا جارہا ہے وہ قرآن وحدیث تک صحیح طریقے پر اور براہِ راست رسائی کے واسطے ہے نہ کہ عربوں سے بات چیت کرنے یا عرب ملکوں میں نوکری کرنے کے واسطے۔ جو عربی کتاب وسنت تک پہنچا سکتی ہے وہ عربی بلیغ اور عربی مبین ہی ہے۔

جب ایسا ہے تو طلبہ پر ابتدائی سالوں میں صرف ونحو، عربی ادب اور بلاغت پر خصوصی محنت کی جانی اور اُن سے کرائی جانی چاہیے، میرے خیال میں ابتدائی عربی گرامر کی جو کتابیں درس نظامی کا حصہ ہیں وہ اس زمانے میں لکھی گئی ہیں جبکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی مادری زبان فارسی تھی جو آگے چل کر اردو زبان میں تبدیل ہوگئی، لیکن مدارس میں عربی گرامر کو اردو میں مرتب کرکے پڑھانے کے بہ جائے فارسی زبان سکھا کر انہی فارسی کتب

سے عربی سیکھنے پر زور دیا جاتا رہا جو کہ ایک زائد کام ہوگیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ جتنی زبانیں عالمِ دین کو آئیں اچھا ہی ہے، لیکن بدلتے حالات کے بعد فارسی کی کوئی خاص ضرورت سمجھ میں نہیں آتی اور نہ ہی طلبہ واساتذہ کو اس سے دلچسپی رہ گئی ہے، برائے نام محض نحو میر، پنج گنج، اور علم الصیغہ پڑھنے پڑھا سکنے کے واسطے اس کی ضرورت ہے، جب کہ اساتذہ یہ ہلکی پھلکی فارسی بھی اردو شرح یا ترجمہ دیکھ کر پڑھا رہے ہیں، اس کے بہ جائے بچوں کو اُن کی مادری زبان ہی کے ذریعے عربی گرامر پڑھانا اور اس میں مہارت پیدا کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، یوں فارسی زبان اردو ادب کے معیار کو درست کرنے کے لیے بقدرِ ضرورت پڑھادی جائے تو پھر بھی ٹھیک ہے، لیکن غور کریں گے تو پتہ چلے گا کہ اب اردو میں بھی عربی وفارسی الفاظ کی جگہ انگریزی الفاظ نے لے لی ہے، حتی کہ علماء کی تحریروں میں تک براہِ راست یا قوسین میں انگریزی الفاظ شامل ہو چکے ہیں، ادبی اردو جو عربی و فارسی کے الفاظ سے مخلوط ہوتی ہے سوائے اہل مدارس کے اور کسی کے لیے مفید نہیں رہ گئی، زیادہ سے زیادہ شعراء، اُدباء اور علماء کے کچھ کام آرہی ہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ جب علماء کو تیار کرنے کا مطلب ہی ’’ایسے افراد کو تیار کرنا ہے جو براہ راست قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کے ماخذ سے استفادہ کر کے امت مسلمہ تک ان کے پیغام اور احکام کو پہنچا سکیں‘‘ تو لازمی ہے کہ ان کے اندر ان دو زبانوں میں مہارت وقدرت پیدا کی جائے، جن کے ذریعے وہ قرآن وحدیث کو سمجھ سکیں اور امت مسلمہ کو سمجھا سکیں، اس لیے فارسی زبان میں وقت ضائع کرنے کے بہ جائے انگریزی اردو اور علاقائی زبان پر توجہ دی جائے تو مقاصد کے حصول میں زیادہ مددگار ثابت ہوگا۔ رہ گیا یہ کہ سلف کی بہت سی مفید کتابیں فارسی زبان میں ہیں تو ان کا کیا ہوگا؟ تو اس کا جواب یہی ہے کہ فی الحال ان سے نہ کوئی استفادہ کر رہا ہے اور نہ وہ بہ آسانی دست یاب ہیں، لائبریریوں میں رکھی ناقابلِ استعمال ہوتی جارہی ہیں، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ زبان سے ناواقفیت ہے۔

ذمہ دارانِ مدارس عربیہ کو اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اسکولوں میں اجنبی زبانیں معصوم بچوں کو کس طرح آسانی سے پڑھادی جارہی ہیں کہ دیکھتے دیکھتے بچے انگریزی اور دیگر زبانیں ـــــ باوجود مادری زبان نہ ہونے کے بھی ـــــ بلاتکلف بولنے اور لکھنے پڑھنے پر قادر ہوجاتے ہیں، ہم لوگ عربی زبان (جو قرآن کی زبان ہونے اور فطرت سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے بہت ہی مانوس زبان ہے) طلبہ کو ڈھنگ سے کیوں نہیں پڑھا پاتے؟ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ہمارے اساتذہ تدریسی نفسیات اور پڑھانے کے اصول وقواعد سے نہ واقف ہوتے ہیں اور نہ عصری اسکول والوں کے تدریسی تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، آخر اس میں

حرج کیا ہے الحکمۃ ضالۃ المؤمن، کسی کے پاس کوئی خوبی ہے اور وہ ہمارے کام آ سکتی ہے تو پھر اس سے اس خوبی کو کیوں نہیں لینا چاہئیے؟ جہاں سے جو چیز ملتی ہے وہاں سے اُسے حاصل کر لینا ہی عقل مندی و سمجھ داری کی بات ہے، ویسے بھی ہم اپنی ضرورت اور کام کی باتیں اہلِ دنیا بل کہ بے دین لوگوں سے تک حاصل کرنے میں کوئی تکلف نہیں کرتے تو دین اور اپنے فن میں کام آنے والی باتیں سیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟

ہمارے ہاں ابتدائی کتب کے اساتذہ ہوم ورک کلاس ورک سے پہلے دے دیتے ہیں، جس کی وجہ سے طالب علم پر بہت بوجھ پڑ جاتا ہے، وہ صرف سبق لکھنے اور رٹنے میں ہی مصروف رہتا ہے بلکہ حیران رہتا ہے کیوں کہ کوئی اس کی مدد کرنے اور حیرانی دور کرنے والا بھی نہیں ہوتا، وہ پہلی دفعہ عربی زبان کے میدان میں قدم رکھتا ہے نہ استاد عربی بولتا ہے نہ ساتھی، سوائے کتاب میں دیے گئے کام کو کر کے لانے کے اور کچھ چارہ نہیں ہوتا، ساتھیوں کی مدد سے جو کچھ بن پڑا کر گزرتا ہے، پھر صحیح غلط ہونے کا سارا وبال اسی کے سر ہوتا ہے، اگلے دن درس گاہ میں پہنچنے کے بعد استاد سے رہنمائی پانے یا شاد باشی ملنے سے کہیں زیادہ مایوس کن اور ہمت شکن ڈانٹ کا خطرہ ستاتا رہتا ہے، حالاں کہ کامیاب استاد وہ ہے جو ہوم ورک دینے سے قبل کلاس ورک کرائے، بورڈ کا استعمال لازماً کرے علم کے لیے اللہ تعالیٰ نے سمع کے ساتھ بصر کو بھی ذریعہ بنایا ہے، ایک ایک قاعدے کی تفہیم زبان اور قلم دونوں سے ہونی چاہیے تاکہ طالب علم کانوں سے سنے بھی اور آنکھوں سے دیکھے بھی، تاکہ حروف ونقوش اپنے مفہوم ومعنیٰ کے ساتھ قلوب میں مرتسم ہو جائیں۔

اصل میں عربی صرف ونحو کی کتابیں مبتدیوں کی کتابیں ہیں، لیول کے اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ اسکول کے پرائمری کلاس کے لیول کی ہوتی ہیں، لیکن ہمارے طلبہ کی عمریں (حفظ کے بعد عالمیت میں آنے کی وجہ سے) 14 / 15 سال کی ہوتی ہیں، اس لئے اساتذہ ان کے ساتھ آٹھویں اور نویں جماعت والوں کی طرح سلوک کرتے ہیں، جبکہ ان طلبہ کو کتاب کے لیول کے اعتبار سے ابھی سات آٹھ سال کی عمر کے مانا جانا چاہیے، اس عمر کے بچے کو جس طرح ایک اسکولی ٹیچر بورڈ کے اوپر سبق لکھ کر چیخ چلا کر پڑھاتی اور بچوں سے رٹواتی اور اغلاط اور انداز کو درست کراتی ہے، پھر ایک ایک بچے سے علیحدہ پڑھوا کر سنتی ہے اس کی ہمت افزائی اور شاباشی کرتی ہے، یا غلط ہونے کی صورت میں پھر سے تفہیم کرتی ہے وغیرہ، اسی طرح عربی کی ابتدائی جماعت کے طلبہ کو پڑھانا چاہیئے، اس کو مبتدیوں کو پڑھانا کہتے ہیں اور اسی کا نام کلاس ورک ہے اور اس کے بعد طالب علم کو ہوم ورک دیا جاتا ہے کہ اب گھر سے یہ کام کر کے لاؤ، تب بچے بہت آسانی سے بقیہ کام کی تکمیل کر لیتے ہیں۔

مدارس عربیہ کے اساتذہ فراغت کے فوراً بعد بغیر کسی تدریسی مشق (ٹیچنگ ٹریننگ) کے مدرس بن جاتے

ہیں، سمجھتے ہی نہیں کہ یہ فن کیا ہے اور اسے کیسے پڑھایا جاتا ہے ہر کتاب کے آغاز میں غرض وغایت بتلائی جاتی ہے مگر اسے سمجھانے کے بجائے رٹا دیا جاتا ہے، خود استاد کے مدنظر یہ نہیں رہتا کہ وہ اس کتاب کے ذریعے طالب علم کو کیا علم دے رہا ہے اور کتاب کا مقصود کیا ہے، اسی طرح اُسے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ کتاب کے اختتام پر طالب علم کو مقصود مل گیا ہے یا نہیں؟۔ بس ان کا کام درجے میں آکر بیٹھنا سن سنا لینا ہوتا ہے بعض کی تو پڑھانے کی آواز بھی نہیں آتی، ہاں! ڈانٹنے اور مارنے کی آواز دور تک سنائی دیتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تعلیمی نفسیات اور تعلیم دینے کا طریقہ جب اپنی اصل میں ایک ہی ہوتا ہے، خواہ وہ تعلیم دینی ہو یا دنیاوی، زبان انگریزی ہو یا عربی، مواد مختلف ہوسکتا ہے لیکن اسے استاد سے شاگرد تک پہنچانے کا طریقہ ایک ہی ہوتا ہے تو وہ طریقہ فن کے ماہرین سے حاصل کرنا چاہئے، اسی طرح اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ تحتانی وسطانی اور فوقانی مراحل میں سے ہر مرحلے کا معیار وانداز اپنے اپنے مرحلے کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔

بہ ہر حال مدارس عربیہ کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنے مدرسے میں پڑھانے والے اساتذہ کی تدریسی تدریب کا کوئی معقول انتظام کریں، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کے لیے کوئی مستند ادارہ ہوتا اور وہاں سے تربیت کے بعد ہی اساتذہ کا تقرر کیا جاتا لیکن اس کا اب تک ملک میں کوئی انتظام نہیں ہوسکا، اس لئے ہر مدرسہ جو عربی درجات رکھنا چاہتا ہے وہ اپنے اساتذہ کے لیے تدریس کی اور تدریسی نفسیات کی تربیت کا خود ہی انتظام کرے اور وقفے وقفے سے فنون پڑھانے والے اساتذہ کی عملی مشق کرائی جاتی رہے، اسی سے طلبہ کی استعداد مضبوط ہوسکتی ہے، فنونِ متعلقہ میں کمال پیدا ہوسکتا ہے، بالخصوص زبانِ عربی پر صحیح معنوں میں قدرت حاصل ہوسکتی ہے، سب سے بڑھ کر یہ کہ اب طلبہ پر بے پناہ بوجھ پڑنے کے باوجود جو کام اطمینان بخش نہیں ہو پا رہا ہے وہ اساتذہ کی ٹریننگ سے بہ سہولت ہوجائے گا، تفصیل اس عنوان کی بہت ہے میں نے مختصراً اشارہ کر دیا ہے، ویسے اس سلسلے میں کتابیں بہت لکھی جاچکی ہیں اور جو ماہر اساتذہ ہیں وہ اپنے اپنے تجربات کی روشنی میں نت نئی کتابیں چھاپتے جارہے ہیں، فنون کے خاکے بناتے جارہے ہیں، میرے نزدیک ان کا فائدہ دس فیصد ہے تو اساتذہ کی ٹریننگ کا فائدہ نوّے فیصد ہے، اساتذہ کی تدریب وتربیت نہیں ہوسکی تو کتابیں چاہے کتنی ہی سہل کرلی جائیں اور چاہے کتنے ہی نقشے خاکے بنائے جائیں حصولِ مقصود ہرگز نہیں ہوسکتا۔

مدارس عربیہ میں عربی گرامر (صرف ونحو) سے ہٹ کر جو فنون رکھے جاتے ہیں یعنی عربی ادب، عربی بلاغت، منطق، فلسفہ یا جدید سائنس تو اِن فنون کے پڑھانے کی بھی مشق ضروری ہے، مناسبت کے بغیر استاد کو کوئی کتاب دے دی جاتی ہے تو وہ ٹائم پاس کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتا، طلبہ میں بھی دلچسپی پیدا نہیں ہوتی،

حالاں کہ وہ اہم کتابیں ہوتی ہیں اور انہیں سے عربی قدیم کا صحیح معنوں میں ذوق پیدا ہوتا ہے، اور عرض کیا جا چکا ہے کہ کتاب وسنت کی صحیح فہم عربی قدیم میں کمال کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔

ہمارے اکابر نے جو عربی شروحات لکھی ہیں انہیں دیکھ کر یہ تاثر ہوتا ہے کہ سلف کے کسی عربی عالم کی تصنیف ہے۔ علامہ زاہد الکوثریؒ نے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہٗ کی ''تکملہ فتح الملہم'' پر انہی تاثرات کا اظہار کیا تھا کہ ''مطالعے کے دوران ایسا لگا جیسا کہ کسی قدیم مصنف کی کتاب ہے۔'' یہ حقیقت ہے کہ حدیث کی عربی شروحات اور عربی تفاسیر سے جو مواد ملتا ہے اور علمی پختگی و پائے داری حاصل ہوتی ہے وہ کسی اور زبان کی کتب سے حاصل نہیں ہوتی، اور نہ ہی تراجم سے وہ لطف و تاثُّر ملتا ہے جو عربی تعبیر سے ملتا ہے، عربی کا ایک جملہ (بالخصوص قدماء کا) بیسیوں صفحات کی تشریحات سے مستغنی کر دیتا ہے۔ اس لیے لسان عرب کے فنونِ متعلقہ کو بھی محض ضابطے کی خانہ پُری اور نصاب کی تکمیل کے واسطے پڑھنے پڑھانے کے بہ جائے مقصود کی اصل اور بنیاد ہونے کی حیثیت سے پڑھانا چاہیے، طلبہ کو اس کی اہمیت اور فوائد بتلانا چاہیے، کسی بھی چیز کے مفید ہونے کا علم ہی آدمی کو اس کے حصول کی خاطر ہر مجاہدے پر آمادہ کرتا ہے۔

آخر ہم طالب علم کے چار سالوں کا بڑا حصہ علوم آلیہ ہی کے لیے لے رہے ہیں، باقی چار سالوں میں علوم عالیہ پڑھا رہے ہیں تو اگر چار سال دے کر بھی طالب علم اردو کتابوں کے ذریعے پڑھتا پڑھاتا ہے عربی کتب کا مطالعہ نہیں کرسکتا، نکتہ آفرینی تو دور کی بات ہے عبارت خوانی تک نہیں کرسکتا تو پھر اس کو عربی سیکھنے میں چار سال لگانے کا فائدہ کیا ہوا؟ اس سے تو بہتر ہے کہ علومِ عالیہ کے اردو تراجم کا نصاب بنا کر اردو میں اچھی طرح پڑھا دیا جائے تو چار پانچ سال میں اتنی معلومات ہوجاسکتی ہیں جتنی اب اکثر فضلاء کو آٹھ نو سال کے بعد ہورہی ہیں۔

میرا ماننا یہ ہے کہ مدارس کی اسی بنیادی کم زوری کی وجہ سے فارغ ہونے والوں میں سے اکثر طلبہ مسلکِ حق کے داعی بن رہے ہیں، اگرچہ وہ بھی ایک کام ہے مگر عالم ہونے کا جو تصور پہلے تھا وہ دن بہ دن کم ہوتا جارہا ہے۔ فالی اللہ المشتکیٰ! یوں تسلی کے لیے تو کہا جاسکتا ہے کہ ہر شعبے ہی میں زوال آگیا ہے استعدادیں اور حافظے بھی مرورِ زمانہ کے ساتھ زوال پذیر ہیں، علم دین کے مراکز بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تو اس میں شکایت کی کیا بات ہے؟ لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد بھی دنیاوی علوم وفنون میں تحقیق و تفتیش، تبدیل وتجدید اور معاون و مؤیّد ذرائع کی تلاش و اختیار کا سلسلہ جاری ہے اور اُن کے منافع بھی ان کو مل رہے ہیں، ہماری طرح جمود تو نہیں کہ طالب علم نصاب کی تکمیل سے عالم ہوجاتا ہے، گذرتے زمانے کے ساتھ مزاجوں اور استعدادوں میں زمین آسمان کا فرق ہوجائے مگر ہمارے ہاں پڑھنے پڑھانے کی روش وہی رہے گی، یہ تو

نہیں کہا جارہا ہے کہ دین بدلو، دینی علوم بدلو، بات صرف یہ ہے کہ وسائل وذرائع کو طلبہ کی طبیعتوں اور صلاحیتوں سے ہم آہنگ کرکے اُنہیں اور زیادہ کام کے قابل بنایا جاسکتا ہے تو کیوں نہ بنایا جائے، مگر اکابر روشِ قدیم چھوڑنے کو مدارس کے لئے زہر سمجھتے ہیں اور اصاغر آؤ تاؤ دیکھے بغیر ہی تجدد پسندی کے شکار ہوجاتے ہیں، ظاہر ہے کہ دونوں سوچ نظرِ ثانی کی محتاج ہیں۔

بہر حال ان فنی کتابوں کو فنی مہارت کے ساتھ پڑھا کر طلبہ کو احکامِ اسلام اور تاریخِ اسلام کے عربی ماخذ تک رسائی کا اہل بنانا علمی پختگی کا سبب ہوگا ورنہ غور کر لینے کے بعد ان فنون کو ختم کرکے وقت بچانا یا ان کی جگہ زیادہ مفید فنون کو شامل کرکے طلبہ کے وقت کو کارآمد بنالینا چاہیے۔

(ب) تدریس علوم:

ہمارے مدارس میں جو مطلوب ومقصود علم ہے وہ قرآن، حدیث، اور فقہ اسلامی کا علم ہے، فقہ کتاب وسنت کا ماحصل ہے، پھر ان تینوں کو صحیح طریقے پر سمجھ سکنے کے لیے وضع کیے گئے اصول ہیں، جو کتاب وسنت کی روشنی ہی میں وضع کیے گئے ہیں تو اصول کو ملا کر یہ کُل چھ علوم ہوگئے، انہی چھ علوم کو علوم عالیہ یا مقصودِ طالب علم کہا جاسکتا ہے، یہ تقریباً چار سال میں درجہ بہ درجہ پڑھائے جاتے ہیں، پھر ان کا اختتام دورۂ حدیث شریف پر ہوتا ہے، آگے تخصصات کے شعبے ہیں جو اختیاری ہیں۔

اس سلسلے میں جو گزارشیں مدنظر ہیں ان میں پہلی بات یہ ہے کہ قرآن مجید (جو کہ اصل الاصول ہے) مدارس میں اس سے طلبہ کے اندر خوب مناسبت پیدا کی جانی چاہیے کیوں کہ وہ دعوتِ دین کا ربانی اسلوب ہے، قرآن مجید کا بیشتر حصہ توحید، رسالت اور آخرت کے حقائق کو ٹھوس اور دوٹوک طریقے پر مگر عام فہم انداز میں پیش کرتا ہے، اس کے لیے ماحولیات سے خوب مدد لیتا ہے، آفاق وانفس میں تدبر کی دعوت دیتا ہے، یہ انداز عامی و عالم دونوں کے لیے یکساں مفید ہے، اگر ترجمہ وتفسیر پڑھانے والے اساتذہ صرف لغت کو حل کروانے اور لطائفِ تفسیر وتاویل بیان کرتے رہنے کے بہ جائے آفاق وانفس کی سیر کراتے ہوئے پڑھائیں یعنی فزیکل و میڈیکل سائنس[1] کی مدد سے وجود وصفات باری تعالیٰ کی معرفت کا کام بھی کریں تو بہت ہی بہتر ہوگا، اللہ تعالیٰ

---

[1] کوئی غلط فہمی نہ ہو اس لئے وضاحت کردیتا ہوں کہ میڈیکل اور فزیکل سائنس سے میری مراد قرآن کی اصطلاح میں آفاق وانفس ہی ہے، نباتات، جمادات، حیوانات اور ماحولیات میں جو بدیہی النظر اسباقِ توحید و ربوبیت ہیں اور جو موجد کے وجود کے دلائل واضحہ ہیں طلبہ کی نظر کو وہاں تک پہنچا کے انہیں عقلاً اُن کا قائل کرانا تا کہ حق تعالیٰ کی معرفت کے ذریعے محبت واطاعت میں کمال پیدا ہوسکے۔

خود ہی فرماتا ہے: سِیْرُوْا فِي الْاَرْضِ، اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللهُ الْخَلْقَ ، اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ ،اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ، فَارْجِعِ الْبَصَرَ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ؛ وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ؛ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا؛ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ ؛ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ؛ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ ....؛ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا؛وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ؛قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ ؛ وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ؛ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ، كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ ؛ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً ؛ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ،وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ اوروَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ...وغیرہ بے شمار آیاتِ قرانیہ ہیں جو آدمی کی ذات میں چھپی اور اس کے اطراف واکناف میں پھیلی سیکڑوں نشانیوں کی طرف متوجہ کرتی ہیں، ان میں غوروفکر کرنے اوران کے ذریعے اپنے خالق ومالک کی معرفت حاصل کرنے کی دعوت دیتی ہیں، اگران مضامین کو اساتذۂ تفسیر وترجمہ خوب اچھی طرح مطالعہ کرکے دلچسپی کے ساتھ پڑھائیں تو ایک تو طلبہ کو قرآن کریم سے خاص لگاؤ ہوجائے گا، حق تعالیٰ کی معرفت ومحبت میں بے پناہ اضافہ ہوگا، دوسرے جو لوگ صرف عصری علوم پڑھے ہوئے ہیں اِن مسلمانوں کو انہی کی معلومات کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی معرفت وعظمت پیدا کرنے کا سلیقہ پیدا ہوگا، جس ذریعے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کے لئے اختیار فرمایا اس سے آسان اور مفید کونسا ذریعہ ہوسکتا ہے؟ قرآن کریم صحیح ہے کہ نہ تاریخ کی کتاب ہے نہ سائنس کی لیاب ہے، وہ تو خالص ایمان ویقین کو بنانے اور توحید ومعرفت کا چسکا لگانے کے لیے اتاری گئی کتاب ہے مگر خود اس کے نازل کرنے والے نے ان مقاصد کے حصول کے لیے جس عام فہم اور سیدھے سادے اسلوب کو اپنایا ہے اس سے صرف نظر کرکے صرف حلِ لغات اور نکتہ آفرینی پر اکتفاء کرلینا طلبہ کے اندر قرآن کریم سے صحیح معنوں میں استفادہ وافادہ کا ذوق نہیں پیدا کرسکتا؛ یقیناً قرآن کریم کے ایجاز واعجاز اور بلاغت وادب کے پہلوؤں کو بھی شاملِ درس ہونا چاہیے لیکن یہ نزولِ قرآن کا اصل مقصد نہیں ہے، اصل مقصد اَحْسَنُ الْحَدِيْثِ کے نزول کا تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ہے یعنی بندے کے قلب اور قالب دونوں کو فدائے مولا کردیا جائے۔ ہمارے مدارس میں ایک تو مختلف قسطوں میں ترجمہ قرآن پڑھادیا جاتا ہے اور ایک مختصر سی جامع تفسیر جس میں زیادہ تر حل لغات ہی پر نظر ہوتی ہے، وہ پڑھائی جاتی ہے، ترجمے میں تو اختصار ہی مناسب ہے لیکن تفسیر پڑھانے کے دوران احکام ومسائل کے علاوہ تذکیر وموعظت پر بھی خصوصی توجہ دی جائے تو طالب علم کے حق میں بہت ہی مفید ہوگا، کیوں کہ قرآن کریم کا یہی حصہ معرفت ومحبت اور خوف وخشیت کے پیدا ہونے کا سبب ہے۔ اور اگر دورانِ نصاب اس کا موقع نہ ہو

توفنون کے سالوں میں سے ایک سال بچا کر یا ایک سال بڑھا کر دورۂ تفسیر رکھا جائے اور اس سے پہلے فراغت کی سند نہ دی جائے۔

علوم عالیہ میں دوسرا موضوع حدیث شریف کا ہے، مشکوٰۃ الآثار سے لے کر دورۂ حدیث تک کچھ نہ کچھ احادیث شریفہ سے طلبہ کو تعلق رہتا ہے لیکن سب سے زیادہ اور باقاعدہ تعلیم تو دورۂ حدیث ہی میں احادیث شریفہ کی ہوتی ہے، اس سال کتابیں بہت ہوتی ہیں مگر وقت کم ہوتا ہے، مزید یہ کہ آج کل طلبہ کی استعدادیں اکثروں کی ناقص ہوتی ہیں، اس لیے دورۂ حدیث شریف کے لئے کم ازکم دو سال رکھے جانے چاہئیں، اور یہ وقت نکل سکتا ہے اگر شروع کے چار سالوں کا نظام درست ہو جائے، نہیں تو کم ازکم کتبِ حدیث پڑھانے والے اساتذہ ہر کتاب کی امتیازی شان کو ملحوظ رکھ کر تدریس کا فریضہ انجام دیں، مثلاً بخاری شریف میں طرقِ اجتہاد و استنباط کو ملحوظ رکھا جائے، ترمذی میں اختلافِ مذاہب کو، مسلم میں طرقِ اسناد کو، ابوداؤد میں دلائلِ احکام کو، نسائی میں معرفت وعلل کو وغیرہ مدنظر رکھ کر پڑھانے سے تعدُّدِ کتب کا صحیح معنوں میں فائدہ ہو سکتا ہے، نیز وقت کے تحفظ کی خاطر ہر کتاب میں مخصوص ومعروف ابحاث کو معرکۃ الآرا مان کر سارا زور اسی پر صرف کرنے کے بہ جائے ہر کتاب کے لیے علاحدہ علاحدہ ابواب طئے کر کے انہیں تفصیلاً پڑھایا جائے بقیہ ابواب تحدیراً پڑھادیے جائیں، تاکہ مجموعۂ کتب سے مجموعۂ ابواب کی تفصیلی معرفت طالب علم کو حاصل ہو جائے۔

اسی طرح کتب حدیث کی تدریس میں عام طور سے احکام ومسائل پر تو روشنی ڈالی جاتی اور اختلافی مباحث میں بطور خاص دلچسپی دکھائی جاتی ہے اور ہونا بھی چاہیئے لیکن حدیث کے اصلاحی، اخلاقی اور سماجی پہلوؤں پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی اسی طرح ابوابِ فتن بھی نظرانداز ہو جاتے ہیں، حالاں کہ ان کی بھی ایک عالمِ دین کو بہ طور خاص ضرورت ہوتی ہے بالخصوص ایک عالم دین کو۔ بہرحال کتبِ حدیث کی کیف ما اتفق اور ہر استاذ کے اپنے اپنے انداز پر نصاب کی تکمیل کر دئے جانے کے بہ جائے منصوبہ بند طریقے پر ان کتابوں کی تدریس ہو تو اور زیادہ نفع کا سبب ہوگا، طلبہ کی علمی صلاحیتیں بھی اور زیادہ بڑھیں گی اور میدانِ عمل میں کامیابی کا بھی سبب ہوگا۔

رہ گئی فقہ کی کتابیں تو اگرچہ وہ مسائل شرعیہ سے واقفیت کے لیے ہیں لیکن عالم دین کو ان کے دلائل جاننے کی بھی ضرورت ہے خاص طور سے اس زمانے میں تو دلائل سے واقفیت کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے، اس لیے کم ازکم ''ہدایہ'' پڑھانے کے لیے ایسے اساتذہ کا انتخاب کیا جائے جو مسائل کو دلائل کے ساتھ پڑھا سکیں اور فقہ حنفی کا اقرب الی السنہ ہونا ثابت کر سکیں، اس لیے کہ ایک تو ہمارے دیار کے طلبہ حنفی ہیں اور سماج میں عام طور

سے جرح وتنقید فقہ حنفی پر ہی ہوتی رہتی ہے ،فضلاءِ مدارس خود مطمئن نہیں تو دوسروں کو کیا اطمینان دلا سکیں گے؟ اس کے لیے ظاہر ہے کہ فقہ سے قبل اصول فقہ کو سمجھنا ضروری ہے اور خود اصول فقہ کا ماخوذ عن الکتاب والسنۃ ہونے کا تیقن بہ دلائل حاصل ہونا بھی ضروری ہے، تا کہ اطمینان ہو جائے کہ یہ ائمہ کے خود ساختہ یا خانہ ساز باتیں نہیں ہیں کتاب وسنت کی حقیقت تک پہونچنے کا منصوص ومسنون راستہ ہیں۔خلاصہ یہ کہ مدارس عربیہ میں کتبِ فقہ کو صرف مسائل جاننے کے لیے پڑھا پڑھایا نہ جائے بلکہ طلبہ کو مسائل فقہیہ کے موافقِ کتاب وسنت ہونے کا اطمینان دلانے کو بھی شاملِ درس رکھا جائے ،تب ہی ہمارے فضلاء اپنی عوام کو اور سماج کا ذہن بگاڑنے والوں کو سیدھی راہ دکھا سکیں گے ،ورنہ ہر ایک مدّعی اور داعی سے کترانے اور دامن بچانے میں عافیت محسوس کریں گے۔ان مشوروں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مدارس میں ان امور کا لحاظ بالکل نہیں ہے بلکہ تذکیر و یاددہانی مقصود ہے ،اس لیے کہ اب افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ نیچے سے لے کر اوپر تک مدرسین کرام کے طرز عمل میں مقصدیت اوراس کے حصول کا جذبہ زوال پذیر ہے،بعض کا حال تو ناگفتہ بہ ہے،ظاہر ہے کہ مقصود سے نظر ہٹ جانا یا مقصود کی زیادہ پرواہ نہ ہونا نتائج کے بگڑ جانے کا سبب بن جاتا ہے، ذمہ دارانِ مدارس کو درجے بڑھانے ہی کی فکر ہے، ذی صلاحیت اور تجربہ کار اساتذہ فراہم کرنے اور ان پر پیسہ صرف کرنے کا خیال نہیں رکھتے، صلاحیت نہ ہونے کے باوجود احباب واقرباء کو کتابیں سونپتے رہتے ہیں ،اور مہتمم کی اس عصبیّتِ جاہلیہ کا شکار خواہ مخواہ طلبۂ مدرسہ ہو جاتے ہیں۔

(ج) تہذیب نفس:

یہ سب جانتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام سے ان کی امتوں کو علم وعمل اور اخلاق کی دولت ملتی ہے، مدارس دینیہ عربیہ کا مقصد اسی دولت و وراثت کا تحفظ ہے، اس لیے مدارس دینیہ میں بالخصوص عالمیت کے شعبے میں (کیوں کہ اس میں سب ہی بالغ اور مکلف طلبہ ہوتے ہیں) طلبہ کی تہذیب نفس کی جانب خصوصی توجہ کی ضرورت ہے کہ علم دین کا مقصد ہی اعمال واخلاق کی تہذیب ہے،قوموں کی ہدایت کے لیے جب اللہ تعالیٰ نے کتاب کو کافی نہیں سمجھا علم پر عمل کر کے دکھانے والے کو بھی مبعوث فرمایا تو اصلاحی نقطۂ نظر سے علم وعمل اور اخلاق حمیدہ کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا،طلبہ سمجھتے ہیں کہ علم کا زمانہ الگ ہے اور عمل کا زمانہ الگ! یہ تو صریح دھوکہ ہے،علم وعمل یکساں طور پر چلتے رہتے ہیں اکثر طلبہ مدارس میں اس دھوکے کے شکار رہتے ہیں، ادھر اساتذہ اور انتظامیہ کو بھی انھیں اس دھوکے سے نکالنے اور اعمال واخلاق کا تزکیہ وتحلیہ کرنے کی ایسی فکر نہیں ہوتی جیسے کہ تعلیمی اعتبار سے اچھے نتائج لانے کی ہوتی ہے، کیا فائدہ اس علم کا جو آدمی کو عمل پر نہ ڈالے؟ بالخصوص عالم کو۔اس

لیے کہ عوام کی عملی کوتاہیاں ان کے عوام ہونے کے پردے میں مستور ہوجاتی ہیں مگر علماء وطلبہ کو تو عوام بھی اخلاق واعمال کے بلند معیار سے پرکھتی ہے، خود اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مطالبہ بھی یہی ہے یعنی خالق ومخلوق دونوں کے نزدیک اہل علم کے لیے اعمال واخلاق میں ممتاز ہونا ضروری ہے۔

اس سلسلے میں مدارس کا انتظامیہ اور خود اساتذہ بھی عنداللہ مسئول ہیں، اس لیے طلبہ کے اعمال واخلاق کی تہذیب کی فکر بہت ضروری ہے، مدارس میں ذمہ داروں کے عدم اعتناء اور عدم انتظام کے نتیجے میں بہت سے طلبہ فرائض سے تک غافل ہیں اور بہت سے فواحش میں مبتلا ہیں، بہت سے بیڑی، گٹکا، تمباکو جیسی لتوں میں مبتلا ہیں، حدیث کی درسگاہ میں تک منہ میں گندگی بھر کے بیٹھتے ہیں، موبائل کے ذریعے ہر بے حیائی میں ابتلا عام ہے، بعض طلبہ داڑھی تراشنے، انگریزی بال رکھے، اور فلمیں دیکھنے کے بھی عادی ہوتے ہیں، صحبتُ الاحداث بھی بعض کا مزاج ہوتا ہے۔ طلبہ کے پاس پیسوں کی کوئی کمی نہیں ہے، مدرسوں میں امدادی داخلہ لیتے ہیں لیکن ہزاروں روپیہ ہر ماہ خواہشات نفسانی میں لٹاتے رہتے ہیں، پڑھنے میں تو کوئی دلچسپی نہیں مگر دوستی دشمنی میں اوقاتِ عزیز برباد کرتے رہتے ہیں۔

انتظامیہ کے مدنظر بس تعلیم اور تعمیر کے معیار کو بلند کرنا ہے اور اسی کی نگرانی اور فکر میں لگے رہتے ہیں لیکن ورع وتقویٰ کو مدارس کے مقاصد میں شمار نہیں کیا جاتا، اس لیے اس باب میں بہت ہی جھول نظر آتا ہے، غور کرنے سے اس کی وجہ کہیں التفات کی کمی اور فکری ذہول سمجھ میں آتی ہے اور کہیں خود ذمہ داروں کی عملی کوتاہی اور اخلاقی بے راہ روی دکھائی دیتی ہے۔ بہرحال مدارس دینیہ میں علم وعمل کی لہر ایک ساتھ چلتے رہنا چاہیے اور چوں کہ یہاں پڑھنے والے قوم کے قائد وراہ نما بننے والے ہیں، اس لیے صفات حمیدہ سے متصف اور صفات رذیلہ سے مجتنب رکھنے کی مشق بھی دورانِ تعلیم ہوتی رہنی چاہیے۔ پہلے زمانے میں مدرسہ ہی علم وعمل اور تہذیب اخلاق کا مرکز ہوا کرتا تھا، فضلاء اگر اس کے بعد خانقاہوں کا رخ کرتے بھی تھے تو وہ مدارجِ سلوک اور مقاماتِ تصوف طے کرنے کے لیے کرتے تھے، باقی مطلوب تدین وتقویٰ تو وہ مدرسے کے ماحول اور اساتذہ اور انتظامیہ کی صحبت سے فراغت سے قبل ہی حاصل ہوجاتا تھا، اب تو خانقاہوں کا نظام بھی کالعدم یا پھر رسمیت کا شکار ہوکر رہ گیا ہے؛ الا ماشاء اللہ، اب یہ علماء جائیں تو کہاں جائیں اور سیکھیں تو کس سے سیکھیں؟ اس لیے مدارس عربیہ کے ذمہ داروں اور اساتذۂ کرام سے گزارش ہے کہ طلبہ کی تہذیب نفس کی جانب اس سے زیادہ توجہ فرمائیں جتنی کہ اب فرما رہے ہیں، اس سے نتائج وثمراتِ مدارس میں کتنا فرق ہوگا وہ وقت ہی بتا سکتا ہے بیان کرنا مشکل ہے۔

(د) تربیت فکر ونظر:

یہ دور افکار ونظریات کے تصادم کا دور ہے، خاص طور سے دین اسلام کے نام پر اہل ہوا و ہوس اور اہل باطل کی طرف سے نت نئے نظریات اور طرح طرح کی تاویلات عام کی جارہی ہیں، انٹرنیٹ کی سہولت نے ہر ایک کے لیے ہر ایک کے نظریے تک رسائی کو آسان بنا دیا ہے، مدرسے کے طلبہ بھی ہر کہہ ومہہ کو جاننے اور اس کے خیالات معلوم کرنے کے لیے بے چین رہتے ہیں، جبکہ فکر وطلب کی آوارگی اچھے اچھے علماء کے لیے سمِ قاتل ہے چہ جائے کہ طلبہ! شروع شروع میں شکیل کے فتنے سے باخبر کرنے کے لیے ہم لوگوں نے علماء کا ایک اجلاس طلب کیا تھا تو جیسے ہی اسٹیج سے اس کا نام لے کر سرگرمیوں کا ذکر شروع ہوا میرے پڑوس میں موجود نوجوان عالم نے بہ جائے مقرر کی طرف توجہ دینے کے اپنا موبائل نکال کر شکیل کے بارے میں سرچ کرنا شروع کر دیا اور چند ہی منٹ میں اس کے توہّمات نکال کر مجھے دکھانے لگا، میں نے کہا: بس اسی طرح لوگ اس کے جال میں پھنستے جارہے ہیں، بلایا کس کام کے لیے گیا ہے، اور آپ کر کیا رہے ہو؟ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر مدارس میں طلبہ کی ذہنی وفکری تربیت نہ کی جائے تو فارغ ہو کر بھی کسی خاص نظرئے کے حامل نہیں ہوں گے، اسی طرح انٹرنیٹ کے فتنے میں خود ہی مبتلا ہو جائیں گے، اور آپ جانتے ہیں کہ موبائل چیک کرتے رہنے کا فتنہ مولوی میں بھی کسی جنون یا نشے سے کم نہیں ہے، ہر ملی فرصت کو اسی لایعنی اور عبث کام کی نذر کر دیتے ہیں، اس لئے مسلک ومشرب اور فکر ونظر کے اعتبار سے ان کا کوئی قبلہ نہیں۔

علمائے دیوبند ایک ایسی جماعت کا نام ہے جو دین کے معاملے میں اہل سنت والجماعت کے اسلاف کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئی ہے اور اس معاملے میں کوئی سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، عقائد اہل سنت اور تعامل سلف میں تصلّب وپختگی کے اسی امتیاز ومزاج نے علماء دیوبند کو ہر خطرے سے بروقت باخبر اور محفوظ رکھا ہوا ہے، مگر اکابر کی روش اصاغر کو یا تو تنگ نظری ودقیانوسی سمجھ میں آرہی ہے، یا پھر تنوّعِ افکار اور تلوُّنِ نظریات کے اس دور میں انہیں بھی ہمہ دانی کا شوق دامن گیر ہو رہا ہے اور مبتلائے تجسس کر کے الحادِ فکری کے خطروں میں مبتلا کر رہا ہے۔

ہمارے مدارس میں عقیدے کی دو کتابیں داخل نصاب ہیں، ایک عقیدۃ الطحاوی، دوسری شرح عقائد نسفی! عقیدۃ الطحاوی کو تو باوجود اس کی جامعیت ومانعیت اور حجیت کے عقائد کا انڈیکس یا فہرست کہنا چاہیے، محشّی نے بھی صرف ان عقائد کو نصوص سے مبرہن کرنے کا کام کیا ہے، جس نے اس کی افادیت کو اگرچہ پڑھا دیا ہے لیکن

وہ تقابلِ ادیان وافکار کے لیے کافی نہیں ہے، یہ مدرس کا کام ہے کہ عصر حاضر کے باطل افکار ونظریات کا بطلان بھی درس کے دوران کرتا رہے، تاکہ حق وباطل کا تقابل باطل کے باطل ہونے اور حق کے حق ہونے کو اچھی طرح واضح کرسکے۔

شرح عقائد کلامی نوعیت کی کتاب ہے، اس کو بھی محض قدیم شروحات کے سہارے فنّی مباحث تک محدود کرنے کے بہ جائے جدید فتنوں کے تعارف وتعاقب کے ساتھ پڑھانا چاہیے تاکہ طلبہ کی فکری استعداد نکھرے اور حق وباطل میں تمیز کی صلاحیت پیدا ہو، پھر درسِ ترجمہ وتفسیر اور درسِ حدیث کے دوران عصر حاضر کے فتنوں پر ہر مناسبت سے فائدہ اٹھا کر روشنی ڈالتے رہنا چاہیے، بخاری کی کتاب الایمان اور کتاب التوحید اس کا بہت اچھا محل ہے لیکن عام طور سے مصنف کے مقصد کو متعین کرنے کی کھینچ تان میں خاصہ وقت نکل جاتا ہے، اب تو طلبہ کی اکثریت ان نکات ولطائف کی متحمل بھی نہیں ہے اور جو ایک چھوٹی تعداد اہل ہے بھی تو ذوقِ علم کی کمی نے ان کی دلچسپیاں کسی اور طرف رُخ کی ہوئی ہیں۔ اس لئے اس وقت کا تقاضہ اور زمانے کی ضرورت یہ ہے کہ قدیم مباحث اگرضروری ہیں تو انہیں ضرور رکھا جائے مگر اُن کی تفہیم کا انداز جدید لیا جائے، اور جدید مباحث کو بصیرت وحکمت کے ساتھ تدریس کے عناصر میں شامل کیا جائے۔ ابوابِ ایمان میں لگی بندھی تشریحات اور ابواب الفتن میں متقدمین کے تخمینات وتطبیقات پر اکتفا کرنے کے بہ جائے ان کے حالیہ مصداقات پر بھی روشنی ڈالی جائے، فیض الباری کے مطالعے کے دوران جگہ جگہ حضرت کشمیری رحمہ اللہ قال هذا اللعين القاديانی کہہ کر زیر درس حدیث سے اس کا ردفرماتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، یہ کیا ہے؟ وہی ذمہ داری کا احساس کہ طلبہ دوران طالب علمی ہی سداد فکر کے حامل بنیں اور فساد فکر سے محفوظ رہیں، کیوں کہ یہ طلبہ ہی کل کے علماء ہیں، امت کے عقائد واعمال کی حفاظت کی عظیم ذمہ داری انہی کے کندھوں پر ہے۔

بہ ہر حال تدریس ـــــ بالخصوص کتاب وسنت کی تدریس ـــــ ایک اہم منصب ہے اور وقیع امانت کی منتقلی کا نام ہے جو استاد اپنے تلامذہ میں منتقل کرتا رہتا ہے، یہ کام اگر اسی نظریۓ اور جذبے کے تحت ہو تو پھر علم کا تنکا بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، استاد انتقال علم میں پائی پائی کا حساب چکا دیتا ہے، افسوس کہ ہمارے ہاں کتب ِاحادیث کے لیے کتابیں زیادہ اور وقت کم رکھا گیا ہے، استاذ چاہ کے بھی زیادہ امور کی طرف توجہ نہیں دے سکتا، اسے نصاب کی تکمیل کا حکم پورا کرنا ہوتا ہے، تدریس کا حق ادا کرنے کا موقع ہی کہاں ملتا ہے؟ یہ تو امانت دار اور فکر منداساتذہ کی مجبوری ہے ورنہ جو اساتذہ تدریس برائے ملازمت کے عادی ہو گئے ہیں وہ تو خود بھی نہیں چاہتے کہ مطالعۂ شروح اور مقابلۂ افکار کی زحمت اُٹھائیں، جتنا اسانی سے کام نمٹ جائے نمٹا دینا چاہتے ہیں، یہ

ہمارے سلف کا طریقہ کبھی نہیں رہا لیکن جب عہد فرنگ میں لارڈ میکالے نے تعلیم کے ذریعۂ معاش ہونے کا نظریہ دیا تو پہلے عصری علوم کی درسگاہیں اس نظریے کا شکار ہوئیں پھر رفتہ رفتہ اس کی کچھ جھلک علوم دینیہ کے مراکز میں بھی دکھائی دینے لگی اوراب تو مدارس دینیہ میں بھی اس کا خطرہ بہت بڑھتا جارہا ہے۔والعیاذباللہ۔

غرض یہ کہ جب مدارس دینیہ کا فارغ بچپن سے جوانی تک مدرسوں میں رہ کر، پل کر،اور پڑھ کر بڑا ہوا ہے تو اس کا عقیدہ اورمسلک انتہائی طاقتور اور مضبوط ہونا چاہیے، یہ اس وقت ممکن ہے جب کہ اسے اپنے بڑوں سے حاصل کردہ علم پر تحقیقاً اطمینان ہو محض تقلیداً نہیں ، بالخصوص باطل افکار ونظریات کا باطل ہونا علم وتحقیق کی روشنی میں اس کےعلم میں آیا ہو اوراس سلسلے میں اُسے کوئی خلجان باقی نہ رہا ہو،اس لئے کہ علم شک وارتیاب کا نام نہیں ، شک وارتیاب کے دور ہونے کا نام ہے۔پھر یہ اس وقت ممکن ہے جب کہ طلبہ بقول حضرت مفتی سعید صاحب رحمہ اللہ مدرسے میں پڑھ رہے ہوں پل نہ رہے ہوں ، درس گاہوں میں تک پڑھنے سمجھنے کے بجائے سو رہے یا آپس میں باتیں کررہے یا خارجی کتب کا مطالعہ کررہے یا موبائل فون میں کھیل رہے طلبہ کیا جانیں کہ علم کس چیز کا نام ہے؟ اُنہیں فراغت اورسند سے مطلب ہے علم سے کوئی سروکار نہیں ،ایسے میں مدرسے کے ذمہ داروں اوراساتذہ دونوں ہی کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ مدرسے کے ماحول اورسرگرمیوں کو طلبہ کے حق میں فکری ،علمی،عملی اورتہذیبی اعتبار سے موثر اورنتیجہ خیز بنائیں ،رسمیت کو مدرسے کے قریب آنے نہ دیں، مقصدیت کو ہمیشہ مدنظر رکھیں۔

جاری۔۔۔۔

گوشۂ خواتین

اسلام کی باکمال خواتین

حضرت فاطمہ بنت ولید رضی اللہ عنہا

(عظیم قاری قرآن سالم مولی حذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ)

از: مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی*

نام ونسب: آپؓ قریش کے خاندان بنوعبد شمس سے تعلق رکھتی ہیں، ان کا سلسلۂ نسب کچھ اس طرح ہے، فاطمہ بنت ولید بن عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا دادعتبہ بن ربیعہ زمانہ جاہلیت میں مکہ کے وجیہ وشریف لوگوں میں شمار ہوتا تھا، مکہ کے عظیم سرداروں میں سے تھا جس کی حلم و بردباری، زبان دانی اور اصابت رائے کا چرچا تھا، نہایت جسیم، رعب دار شخصیت کا مالک تھا، عتبہ نے بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پایا، سرکشی کی، اسلام قبول نہیں کیا، غزوہ بدر میں مشرکین کے ساتھ آیا، حمزہ بن عبد المطلب کے ہاتھوں ستر سال کی عمر میں جہنم رسید ہوگیا، اس کے ساتھ اس کا بھائی شیبہ بن ربیعہ اور اس کا بیٹا یعنی حضرت فاطمہ کا والد ولید بن عتبہ دونوں حضرت علیؓ کے ہاتھوں مارے گئے۔

(اسد الغابۃ، فاطمۃ بنت الولید بن عبۃ، ۷/۲۲۶، دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

قبول اسلام: حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے چچا ابوحذیفہ بن عتبہ، ابو ہاشم بن عتبہ، پھوپھی ہند بن عتبہ، خلیفہ اموی حضرت امیر معاویہ بن ابوسفیان، ام ابان بنت عتبہ کے ساتھ اسلام قبول کیا۔

نکاح: فاطمہ دختر ولید بن عتبہ اولین مہاجرات اور قریش کے عظیم عورتوں میں شمار ہوتی تھی، ان کے چچا ابو حذیفہ بن عتبہ نے انہیں سالم مولی حذیفہ جو عظیم قاری شمار ہوتے ہیں، ان کے نکاح میں دیا، جو جنگ یمامہ میں مارے گئے۔(الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ، فاطمۃ بنت الولید، ۸/۲۷۷۔ دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

شوہر کی شہادت اور صبر واستقامت: ان کے شوہر سالم مولی ابو حذیفہ کا پورا نام سالم بن عبید اللہ بن ربیعۃ، ابو عبد اللہ کی کنیت سے ملقب ہیں، یہ فارس کے اصطخر نامی علاقے سے تعلق رکھتے تھے، عظیم اور کبار صحابہؓ میں ان کا شمار ہوتا ہے، بلکہ مہاجرین کی فہرست میں گنے جاتے ہیں، اس لئے کہ ان کی آقا ثبیۃ الانصاریہ زوجہ

* ادارہ علم وعرفان، حیدرآباد، واستاذ حدیث دار العلوم دیودرگ

محترمہ حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ نے ان کو آزاد کیا تو ان کو ابوحذیفہ نے متبنیٰ بنالیا، اس لئے قبیلہ قریش میں شمار ہونے لگے، ان کو اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عظیم قراء اربعہ میں شمار کیا ہے ''خذوا القرآن من أربعة ابن ام عبد وأبی بن کعب ومعاذ بن جبل وسالم مولی ابو حذیفة'' انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ آمد سے قبل مدینہ ہجرت کی، مدینہ میں مہاجرین کی امامت فرماتے، جن میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ وغیرہ بھی موجود ہوتے، قرآن کا بڑا حصہ انہوں نے حاصل کیا ہوا تھا، انہوں نے جنگ بدر، احد، خندق اور تمام غزوات میں شرکت کی، جنگ یمامہ میں قتل ہوئے۔ (اسد الغابة، سالم مولی أب حذیفة، ۲/ ۱۵۷، دار الفکر، بیروت، عام النشر: ۱۴۰۹ھ، ۱۹۸۹م)

حضرت سالم نے جنگ یمامہ کے موقع سے زید بن خطاب کے شہید ہونے کے بعد مسلمانوں کا جھنڈا اپنے ہاتھ میں لیا، ان کے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے گئے، اپنے سینے سے جھنڈے کو چمٹائے ہوئے قرآن کریم کی آیت گنگنار ہے تھے ''وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ (سورہ آل عمران: ۱۴۴) اسی حالت میں ان کی شہادت واقع ہوگئی۔

بعد میں مسلمانوں نے شہداء کا جائزہ لینا شروع کیا تو دیکھا کہ حضرت سالم جان کنی کی حالت میں ہیں، انہوں نے حضرت حذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ بنت ولید رضی اللہ عنہا کے چچا کے سلسلہ میں دریافت کیا تو انہیں بتایا گیا کہ وہ بھی جام شہادت نوش کر چکے ہیں، حضرت سالم رضی اللہ عنہ نے انہیں ان کے بازو میں دفنانے کی وصیت کی، جب کہ حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ اور سالم ایک ہی جگہ شہادت پا چکے تھے، پھر حضرت سالم رضی اللہ عنہ نے تھوڑا سا مسکرایا اور جان جاں آفرین کے حوالہ کردی۔

نہایت عظیم اور مخلص صحابیہ تھیں، نہایت سعادت منداور خوش بخت بیوی تھی، اپنے شوہر حضرت سالم کی خوب خدمت گذاری کی، ان کا زندگی بھر ساتھ نبھایا۔ اپنے شوہر کے وفات پر صبر واستقامت اور بہادری وشجاعت کا ثبوت دیا، اسلام اور دین کے لئے اپنے شوہر ارجمند کے ساتھ کے بڑی قربانیاں دی۔

روایات: ان سے ایک روایت بھی منقول ہے کہ ابوبکر بن حارث نے فاطمہ دختر ولید ام ابوبکر سے روایت کیا کی کہ جب میں شام میں تھی تو اپنے جبے ریشمی کپڑے سے بناتی تھی، پھر میں نے ریشمی ازار استعمال کرنا شروع کردی، مجھ سے پوچھا گیا: کیا ریشمی جبہ کافی نہیں تھا، کہ تو نے ریشمی ازار پہننا بھی شروع کردیا تو میں نے جواب دیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنا کہ ایسی ازار استعمال کی جائے۔ ''فقالت: سمعت رسول اللہ ﷺ یأمر بالإزار'' (اسد الغابة، فاطمة بنت الولید بن عبتة، ۷/ ۲۲۶، دار الکتب العلمیة، بیروت)

وفات: ان صحابیہ رضی اللہ عنہا کے مزید حالات کتب تاریخ میں نہیں ملتے۔

گوشہ سیرت

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ہم نشینوں کے ساتھ

از: مرتب*

حضرت حسین بن علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ابا جان سیدنا علیؓ سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ہم نشینوں کے ساتھ کیسے رہتے تھے؟ آپؓ نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خندہ رو، خوش اخلاق، نرم خو تھے، بداخلاقی، سخت مزاجی، شور وغُل، فحش گوئی، عیب جوئی اور بخل وکنجوسی سے پاک تھے، جو بات یا کام پسند نہ ہوتا تو اُس سے اعراض فرماتے، کسی دوسرے کو پسند ہوتا تو اُسے منع کر کے مایوس نہ کرتے، اور کوئی ناپسندیدہ بات کی دعوت دیتا تو اُسے قبول نہ فرماتے؛ بل کہ خوش اسلوبی سے منع فرمادیتے۔ تین باتوں سے خود کو محفوظ رکھتے تھے (۱) لڑائی جھگڑا، (۲) تکبر، (۳) لایعنی وبے کار بات اور تین باتوں سے لوگوں کو بچائے رکھتے تھے: (۱) کسی کی برائی نہ فرماتے، (۲) کسی پر عیب نہیں لگاتے تھے، (۳) کسی کا عیب بھی تلاش نہ کرتے تھے۔

وہی بات فرماتے جس میں ثواب کی اُمید ہوتی اور جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تکلم فرماتے تو صحابہؓ سر جھکائے سراپا گوش ہوتے، ایسا لگتا جیسے اُن کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں (کہ ذرا سی جنبش سے اُڑ جائیں) جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سکوت فرماتے تب صحابہ کرامؓ بولتے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے صحابہؓ کرام کسی بات پر لڑتے جھگڑتے نہیں اور کوئی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بات کر رہا ہوتا تو سب اس کے فارغ ہونے کا خاموشی سے انتظار کرتے ہر ایک کی بات بہ غور سماعت فرماتے، صحابہؓ کسی بات پر ہنستے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی مسکراتے، وہ کسی بات پر حیرت ظاہر کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی متعجب ہوتے، کوئی اجنبی مسافر سخت لب ولہجہ میں بات کرتا اور کچھ مانگتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تحمل سے کام لیتے، (اور اس کی باتوں کا صبر کے ساتھ جواب دیتے) حتیٰ کہ صحابہؓ کرام ایسے کسی بدّو کو پکڑ لے آتے، تاکہ اُس کے سوالات سے صحابہؓ کو علمی فائدہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے: کہ کسی ضرورت مند سائل کو دیکھو کہ وہ کچھ مانگ رہا ہے تو اس کی ضرورت پوری کرو۔ کسی کے ساتھ حسنِ سلوک پر بے جا تعریف سننا پسند نہ فرماتے تھے، ہاں کلماتِ تشکر ادا کرنے کی حد تک گنجائش ہوتی۔ کسی کی بات نہ کاٹتے تھے، ہاں اگر حد سے تجاوز کرتا تو منع فرمادیتے یا وہاں سے چلے جاتے۔ (شمائل الترمذی: ۳۳۶)

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

گوشۂ سیرت

سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک دل چسپ باب!

حضرت شیما رضی اللہ عنہا

از: مفتی محمد سلمان قاسمی محبوب نگری*

زمانۂ قدیم سے عرب میں یہ رواج چلا آرہا تھا کہ رؤسا اپنے نومولود بچوں کی اعلی تربیت اوران کوزبان کی شائستگی سے آراستہ کرنے کے لیے دیہاتوں میں پرورش کے لیے بھیجا کرتے تھے، ایک تو دیہاتوں کی آب وہوا بھی تازی ہوتی ہے، نیز نو واردلوگوں کا اختلاط نہ ہونے کے سبب وہاں کی زبان بھی نہایت فصیح وبلیغ ہوا کرتی تھی، حسب دستور سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ ماجدہ نے بھی اپنے ننھے نونہال کو حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے ہم راہ بنوسعد کے علاقے کو روانہ کیا، مکّے کے سنگلاخ پہاڑوں کے عقب میں 50 میل مشرق کی جانب ہرے بھرے باغات، خوش نما وسرسبز پہاڑیوں کے بیچ نہایت صاف چشموں سے مزیّن ایک خوب صورت وادی" طائف" کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں اوراس کے اطراف عرب کے دوقبائل بنوثقیف اور بنوہوازن قیام پزیر تھے، یہ دونوں قبائل نہایت طاقت وراور بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ فصاحت وبلاغت میں دیگر قبائل سے ممتاز تھے، نہ صرف یہ خالص عربی کا تکلم کرتے، بلکہ الفاظ کا تلفّظ، ادائی اور اندازِ بیان کی حفاظت کا بھی پورا اہتمام کرتے تھے۔ جیسا کہ اوپر مرقوم ہوا کہ شہر کے رؤسا اور شرفا اپنے نومولود بچّوں کو دیہی لوگوں بالخصوص مذکورہ قبائل کی عورتوں کے حوالے کر دیا کرتے تاکہ رضاعت کے دنوں میں بچّے کھلی آب وہوا اور خالص ماحول میں بہترین جسمانی تربیت کے ساتھ فصیح وبلیغ عربی زبان بھی سیکھ لیں۔ آپ علیہ السلام کا خود ارشاد ہے: ''مَیں تم سب میں فصیح تر ہوں، کیوں کہ مَیں قریش کے خاندان سے ہوں اور میری زبان بنی سعد بن بکر کی زبان ہے، جو عرب کے فصحاء کے طور پر مشہور تھے۔'' بنی سعد، قبیلہ ہوازن کی ایک شاخ ہے۔ (طبقات ابنِ سعد 1/119)

آپ علیہ السلام پانچ سال ہوازن کی شاخ بنوسعد میں حضرت حلیمہ کے گھر گزارنے کے بعد حضرت آمنہ کے حوالے کردیے گئے، پھر دور نبوت آیا، عرب کے گوشے گوشے میں اسلام کے نغمے پڑھے جانے لگے، اور صحابہ کرامؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایما وارشاد کے مطابق اسلام کی تبلیغ کے لیے جزیرۃ العرب کے دورے کرنے

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

لگے،اس دوران کئی جنگیں ہوئیں،انہیں جنگوں میں سے ایک مشہور ہوازن کی جنگ ہے،اس جنگ میں مسلمانوں کو شاندار فتح نصیب ہوئی اور بہت سارے لوگوں کو قید کیا گیا،ان قیدیوں میں ایک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضاعی بہن حضرت شیما بھی تھیں۔

نام اور لقب:

حضرت شَیْمَا رضی اللہ عنہا کا اصل نام حُذَافَہ بنتِ حَارِث تھا لیکن نام پر "شَیْمَاء" لقب غالب آ گیا۔شیما عربی میں بلند مرتبے والی کو کہتے ہیں،آپؓ حضرتِ سیّدتنا حلیمہ سعدیہؓ کی سگی بیٹی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رِضاعی (دودھ شریک) بہن ہیں۔(سیرۃ ابنِ ہشام،ص67،66)

آپؓ کا خاندان:

آپ علیہ السلام کا بچپن حضرت حلیمہؓ کے گھر میں گزرا،جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چار،بہن بھائی موجود تھے،جن کے نام عبداللہ،انیسہ،حذیقہ اور حذافہ (شیماء) تھے۔حضرت حذافہ جو کتب سیرت میں شیما کے نام سے معروف و متعارف ہیں،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سات سال بڑی تھیں؛شیما کے والد کا نام حارثؓ بن عبدالعزیٰ بن رفاعۃ السعدیۃ اور والدہ کا نام حلیمہؓ بنتِ ابی زوَیب السعدیۃ ہے۔اماں حلیمہؓ کے بیٹے عبداللہؓ، آنحضرت سے چند ماہ بڑے تھے۔عبداللہؓ اور حضرت شیماؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکہ میں قیام کے دوران اسلام قبول کیا۔

حضرت شیماؓ مسلمانوں کے قید میں:

اس مختصر سے تعارف کے بعد اشارہ کردہ واقعہ کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں کہ مجاہدین کا دستہ جب حضرت شیما کو گرفتار کرنے لگا تو انہوں نے عجیب بات کہی جسے سن کر سبھی حیرت و استعجاب سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے، حضرت شیما نے فرمایا"میں تمہارے قائد اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بہن ہوں۔"اولاً تو سبھی کو تعجب ہوا کہ آپ کی بھی کوئی بہن ہے،کیوں کہ آپ کے کوئی حقیقی بھائی بہن نہیں تھے،پھر فوج کے کمانڈر نے کہا کہ محترمہ کو سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور پیش کیا جائے۔

خدمت اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضری:

آپ علیہ السلام حنین کے معرکہ کے تئیں آگے کی کارروائی کے سلسلے میں صحابہ کرامؓ کے ساتھ محو گفتگو تھے کہ ایک شخص نے آکر عرض کیا یا رسول اللہ! قیدیوں میں ایک عورت کہہ رہی ہے کہ وہ آپ کی بہن ہے،آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے ان کو پیش کرنے کی ہدایت دی، جب حضرت شیما ؓ آپ کے رُوبرو آئیں تو آپ پہچان نہ سکے، اس لیے کہ ملاقات نہ ہوئے بہت طویل عرصہ ہو چکا تھا اور حضرت شیما بوڑھی ہو چکی تھیں، انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! میں آپ کی رضاعی بہن شیما ہوں، آپ نے تصدیق کے لیے کوئی علامت دریافت کی تو حضرت شیما جھٹ سے کہنے لگی، آپ نے بچپن میں جب ہم کھیل رہے تھے ایک دفعہ میرے جسم پر کتر لیا تھا، آج تک بھی اس کا نشان موجود ہے، پھر انہوں نے وہ نشان بتلایا، یہ سنتے ہی یکسر سارا بچپن حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نگاہوں میں گھومنے لگا، بچپن کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے اپنی اس بہن کی ملاقات سے آبدیدہ ہو گئے، پھر آپ نے بہن کے اکرام میں اپنی مبارک چادر کو فرش بچھایا اور ان کو بڑے اکرام کے ساتھ بٹھایا، بھائی بہن کے درمیان گفتگو ہوئی، پھر آپ نے فرمایا: بہن! اگر تم یہاں میرے پاس رہنا چاہتی ہو تو پورے اکرام ومحبت کے ساتھ رہ سکتی ہو، اور اگر واپس اپنے قبیلے میں جانا چاہتی تو تم کو اختیار ہے، انہوں نے واپس جانے کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے بہت سا مال، چند اونٹ تین غلام و باندیاں اور دیگر مویشی عنایت فرماتے ہوئے پورے عزّت واحترام کے ساتھ چند محافظوں کے ہمراہ اُن کو گھر روانہ کیا۔ بنی سعد کے لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت شیماء ؓ کو ایک مکحول نامی غلام اور ایک لونڈی بھی دی تھی۔ حضرت شیماء ؓ نے اُن دونوں کی آپس میں شادی کروادی تھی، جن کی نسل آج بھی باقی ہے۔ (سیرت ابن ہشام 3/167,166)

بعد ازاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ حنین کے دَوران گرفتار کیے گئے بنوہوازن کے تمام چھے ہزار قیدی رہا فرمادیے اور اُن کا مال وغیرہ بھی واپس کردیا۔

حضرت شیما ؓ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک حسین اور دل چسپ باب ہے، بچپن میں بھائی بہن کا اچھل کود، بہن کی اس رضاعی بھائی پر وارفتگی، اس کے ساتھ حد درجہ محبت وتعلق کا ایک قیامت خیز منظر ہوا کرتا تھا؛ آپ کے حقیقی بھائی بہن گرچہ کوئی نہیں تھے، لیکن حضرت حلیمہ ؓ کے گھر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ سب کچھ محبتیں پائیں جو ایک نوخیز کو ایک خاندان میں ملنی چاہیے، یہی وجہ تھی کہ جب حضرت شیما طویل عرصے کے بعد اپنے بھائی کے پاس آئیں حال یہ کہ دل گھبرایا ہوا ہے، ہیبت وعظمت سے معمور ہے، قبیلہ قید ہو چکا ہے، خود بھی ایک قیدی ہیں، اب بھائی وہ نہیں جو بچپن میں ساتھ کھیلتا تھا، دل لگی کرتا تھا، اب وہ امام الانبیاء ہے، سرکارِ دوعالم ہے، اس کے اطراف ہزاروں عاشقوں کا ہجوم، چشمِ زدن پر ہزاروں دیوانے جان نچھاور کرنے تیار کھڑے ہیں، پھر یہ کہ ایک طویل عرصہ ہو چکا ہے، ایا وہ مجھے پہچانے گا بھی یا نہیں، پہچانے گا تو کچھ مراعات بھی ہوگی یا نہیں، وہ اب صرف محمد بن عبداللہ نہیں، حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، بہر حال اس طرح کے انوکھے اور

مختلف خیالات کا ورود حضرت شیما کے ذہن کو پریشان کئے ہوئے تھا، لیکن جب پہونچیں تو کیا دیکھا یہاں تو منظر ہی کچھ اور ہے، جس کو میں نے دنیا کا بادشاہ سمجھا وہ تو آج بھی وہی معصوم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) ہے، اسی طرح بہن سے محبت کرتا ہے، وہی ادب واحترام بلکہ اب تو اس کے احترام میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے، اتنے طویل عرصے کے بعد بہن کے دیدار سے اس کی کیفیت بدلی ہوئی ہے، آنکھوں سے اشکوں کی لڑی بنی جارہی ہے، وہ بچپن کے ایک ایک قصے کو ایسے یاد کر رہا ہے، ایسے دہرا رہا ہے گویا حضرت شیما دل دل میں سوچ رہی ہوں گی کہ یا اللہ! یہ میرا بھائی رحمۃ للعالمین دنیا اس کے نور سے منور ہو رہی ہے، اور میں اب تک اس سے محروم ہوں، ابھی تک میں نے اس کا کلمہ نہیں پڑھا، بس کیا تھا بھائی کی اس انکساری واکرام اور محبت وتعلق کو دیکھ کر بے ساختہ کہہ اٹھیں! اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وانک رسول اللہ، اور نعمت اسلام سے بہرہ ور ہو گئیں، ایک بھائی کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی بہن نے جہنم کی ابدی مشقتوں سے نجات پا کر جنت کا پروانہ حاصل کرلیا ہو، مزید یہ کہ اب تک تو خود اندھیرے میں تھیں، لیکن اب روانہ ہوئیں تو بھائی کی فکروں کو لے کر، اس کے مشن کو لے کر کہ اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اس شمع سے اپنے قبیلے کو بھی روشنی دوں گی، انہیں بھی اندھیروں سے نکالوں گی، وہ جا کر اپنے قبیلے والوں کو بھی اسلام کی دعوت دیں تو ان کی دعوت پر کئی گھرانوں نے اسلام قبول کیا، دنیا والوں نے اُس منظر کو بھی دیکھا کہ ایک دور اسلام کا اور آپ کی حیات طیبہ کا ایسا جہاں سگا چچا ابولہب مکہ کی گلیوں میں اپنے بھتیجے کو پاگل کہہ رہا ہے، لوگوں کو آپ سے برگشتہ کر رہا ہے، قبیلے والوں کو آپ سے چوکنا رہنے کی تاکید کر رہا ہے اور آج کا یہ دن کہ ایک بہن اپنے بھائی کی اسی آواز کو لے کر قبیلہ والوں کو اسلام کی طرف بلا رہی ہے۔ سبحانہ ما اعظم شانہ

آگے حضرت شیما رضی اللہ عنہا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بچپن کچھ واقعات ذکر کئے جاتے ہیں۔

حضرت شیما رضی اللہ عنہا اور حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پرورش:

حضرت شیما رضی اللہ عنہا آپ کی پرورش وتربیت میں بڑی دلچسپی لیتی تھیں، آپ کی شان میں مدحیہ اشعار و نغمے گنگناتیں، اپنی والدہ ماجدہ کا ہاتھ بٹاتے ہوئے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں، چنانچہ ''الاصابہ'' میں ہے کہ آپ رضی اللہ عنہا سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو گود میں بہلاتے ہوئے یہ لوری دیتی تھیں:

يَا رَبَّنَا أَبْقِ لَنَا مُحَمَّدًا حَتّٰى أَرَاهُ يَافِعًا وَأَمْرَدَا

ثُمَّ أَرَاهُ سَيِّدًا مُسَوَّدَا وَاكْبِتْ أَعَادِيهِ مَعًا وَالحُسَّدَا

وَأَعْطِهِ عِزًّا يَدُوْمُ أَبَدًا

”اے ہمارے رب! ہمارے لئے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو باقی رکھنا، تاکہ میں انہیں بھرپور جوان ہوتا دیکھ سکوں، پھر میں اِنہیں سردار کے روپ میں دیکھوں اور (اے اللہ!) ان کے دشمنوں اور حاسدین کو ذلیل و رُسوا کرنا جبکہ انہیں دائمی عزت دینا۔“ (الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ج8،ص206)

ایک مرتبہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوری دیتے ہوئے اور آپ کے حسن کی توصیف کرتے ہوئے اپنی محبت کا اظہار کچھ اس طرح کیا:

مُحَمَّدٌ خَيْرُ الْبَشَرْ مِمَّنْ مَّضٰى وَمَنْ غَبَرْ
مَنْ حَجَّ مِنْهُمْ اَوِ اعْتَمَرْ اَحْسَنُ مِنْ وَّجْهِ الْقَمَرْ
مِنْ كُلِّ اُنْثٰى وَذَكَرْ مِنْ كُلِّ مَشْبُوبٍ اَغَرّ
جَنِّبْنِى اللهُ الْغِيَرْ فِيْهِ وَاَوْضِحْ لِىَ الْاَثَرْ

”حج وعمرہ کرنے والوں میں سے جو گزر چکے ہیں اور جو موجود ہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان میں سب سے بہتر ہیں۔ آپ خوبصورت اور روشن چہرے والے تمام مردوں اور عورتوں سے زیادہ خوبصورت ہیں بلکہ آپ کا حُسن و جَمال تو چاند سے بھی بڑھ کر ہے۔ اے میرے رب! مجھے حَوادِثِ زمانہ سے بچا اور مجھ پر ان کے نشانات کو واضح فرمادے۔“ (سُبُل الہدیٰ والرَّشاد، ج1،ص381)

بادل سایہ کرنے کا واقعہ:

بچپن میں ایک دن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوپہر کے وقت حضرت شیما رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ گھر سے باہر تشریف لے گئے، گرمی بہت تھی، حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا تلاش میں نکلیں، کیا دیکھتی ہیں کہ حضرتِ شیما رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گود میں لئے یہ اشعار پڑھ رہی ہیں۔

هٰذَا أَخٌ لِي لَمْ تَلِدْهُ أُمِّيْ
وَلَيْسَ مِنْ نَسْلِ أَبِيْ وَعَمِّيْ
فَدَيْتُه مِنْ مخولٍ مُعِمّ
فَانْمِهِ اللّٰهُمَّ فِيْمَا تُنْمِيْ

”یہ میرے وہ بھائی ہیں جو میری ماں سے پیدا نہیں ہوئے اور یہ میرے والد اور چچا کی نسل سے بھی نہیں ہیں، لیکن میں ان پر اپنے معزز ماموں اور چچا فدا کرتی ہوں، اے اللہ! تو ان کی بہترین پرورش فرما“

حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: بیٹی شیما! انہیں اس گرمی میں لئے کیوں پھر رہی ہو؟ عرض کیا: امی جان! ان کو گرمی نہیں پہنچتی ہے؛ کیوں کہ دھوپ سے حفاظت کے لئے ان پر ایک بادل سایہ فگن رہتا ہے، جب

یہ چلتے ہیں تو بادل بھی چل پڑتا ہے، جب یہ رُک جاتے ہیں تو بادل بھی رُک جاتا ہے۔(سیرۃ حلبیہ، ج 1، ص 150)

بچپن میں شق صدر کا واقعہ:

حضرت شیماؓ کہتی ہیں کہ "ایک مرتبہ دوپہر کے وقت ہم بچّے مل کر گھر سے دور واقع ایک وادی میں کھیل رہے تھے کہ اچانک دو نورانی صُورت اور لمبی داڑھیوں والے لوگ آئے، جو سفید لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے میرے بھائی (حضرت) محمّد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پکڑ کر زمین پر لِٹایا اور سینے پر چُھری پھیر دی۔ یہ ہول ناک منظر دیکھ کر ہم سب بچّے چیختے چلّاتے گھر کی طرف بھاگے اور امّاں، ابّا کو بتایا کہ کسی نے بھائی کو (نعوذ باللہ) قتل کر دیا ہے۔ وہ دوڑتے ہوئے اُس جگہ پہنچے، تو دیکھا کہ آپؐ بیٹھے ہوئے ہیں، لیکن چہرۂ مبارک کا رنگ اُڑا ہوا ہے۔

یہود کی آمد کا واقعہ:

حضرت شیماؓ کا ہی بیان ہے کہ: ایک دن دو یہودی راہب ہمارے گاؤں آئے اور میرے بھائی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں پوچھتے پوچھتے ہمارے گھر تک پہنچ گئے۔ اُنہوں نے بھائی کو دیکھا، تو بولے "کیا یہ بچّہ یتیم ہے؟ حلیمہؓ کو اُن کے اِس طرح پوچھنے پر کچھ شک سا گزرا، بولیں "نہیں، مَیں اِس بچّے کی ماں اور یہ ساتھ میں اِن کے والد حارث ہیں۔" یہودیوں نے کہا، "اگر یہ بچّہ یتیم ہوتا، تو ہم اسے قتل کر ڈالتے۔" اس واقعے کے بعد حضرت حلیمہ گھبرا گئیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو واپس اُن کی والدہ کے پاس چھوڑ آئیں۔"

قوم کا ارتداد اور حضرت شیما کا شاندار دفاع:

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقال ہوا، تو ان کی قوم (بنو سعد) اسلام سے برگشتہ و مرتد ہو گئی، اس موقع پر شیما رضی اللہ عنہا نے بہادری کا مظاہرہ کیا اور پورے عزم سے اسلام کا دفاع کیا یہاں تک کہ اللہ نے ان کی قوم کے فتنہ کو ختم کر دیا، اور وہ دوبارہ اسلام کی طرف لوٹ آئے۔

حضرت شیماؓ بہت زیادہ عبادت گزار اور زاہدہ تھیں، اور اپنے اشعار میں اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوب تعریف کیا کرتی تھیں۔ وہ مسلمانوں کی مدد کیا کرتی تھیں، اور اہل اسلام کا حوصلہ بڑھاتی تھیں، آخری دم تک اسلام کی حفاظت واشاعت کرتے ہوئے اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ رضی اللہ عنہا ورضت عنہ۔

گوشۂ سیرت

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوۂ حسنہ بحیثیت شوہر

از: مفتی احمد عبید اللہ یاسر قاسمی*

سیرت طیبہ تمام شعبہائے زندگی کے لیے مشعل راہ

خالق کائنات نے بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لیے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت سے سرفراز فرما کر مبعوث فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ تمام شعبہ ہائے زندگی کے لیے مشعل راہ اور مثالی اُسوہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا کے کامل ترین انسان، اعلیٰ حکمران، بہترین سپہ سالار، قاضی، تاجر، اور ساتھ ہی ساتھ کامل شوہر بھی تھے، بحیثیت شوہر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی پہ نظر دوڑائیں تو عمدہ آبگینوں سے مزین نظر آتی ہے جو کہ موجودہ زمانے میں تمام خاوندوں اور شوہروں کے لیے قابلِ نمونہ اور لاثانی طرزِ عمل ہے۔

حیات انسانی کا خاصہ

انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ ایسے ہم مزاج اور ہم مذاق کی جستجو کرتی ہے، جو ایک طرف اس کی زندگی کی محفل کو سنوارے تو وہیں خوشی کی بزم اور مزاج و مذاق کی انجمن کو آراستہ کرے، بلکہ زندگی کے ہر موڑ پر مصائب کی شدت اور تکالیف کی سختی کو برداشت کرنے میں بھی ساتھ دے، روٹھی ہوئی مسکراہٹ کو بحال اور رنج کے اشکوں کو مٹانے، دَرد کا درماں اور دکھ کا مداوا بننے کی صلاحیت بھی رکھے، تو اس کے لئے خلاّقِ عالم نے مرد کی زندگی میں جہاں عورت کو باعثِ تسکین اور لائقِ قرار بنایا تو وہیں شریک حیات کو کیف وسرور اور راحت وشادمانی کا ذریعہ بھی بنایا قرآن مجید نے اپنے بلیغ پیرائے میں اس کو اس طرح بیان کیا ہے: هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (البقرۃ: ۱۸۷) ''وہ تمہارے لئے لباس اور تم ان کے لئے لباس ہو''

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گھریلو زندگی کی ایک جھلک

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خارجی زندگی جس طرح شاندار ہے اِس سے کہیں زیادہ آپ کی گھریلو اور معاشرتی زندگی پاکیزہ اور قابلِ تقلید ہے؛ موجودہ دور میں لوگ گھر کے باہر بڑی عزت کے حامل ہوتے ہیں جبکہ اپنے اہل

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

خانہ سے رابطہ درست نہیں ہوتا، ترشی، سخت مزاجی سے اہلِ خانہ پریشان رہتے ہیں، جس سے گھریلو ماحول تباہ و برباد ہوجاتا ہے لیکن تاجدارِ انبیاء علیہ السلام کی گھریلو زندگی ایسی پاکیزہ تھی کہ دعویٰ نبوت کے بعد سب سے پہلے تصدیق کرنے والی شخصیت اگر کوئی تھی تو وہ آپ کی رفیقۂ حیات حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا تھیں، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ازدواجی زندگی میں آپ علیہ السلام کا کردار نہایت پاکیزہ اور عمدہ تھا خود پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد عالی ہے: تم میں سب سے اچھا شخص وہ ہے جو اپنے گھر والوں کی نظر میں اچھا ہو اور میں اپنے گھر والوں کی نظر میں سب سے اچھا ہوں۔ (مجمع الزوائد ٤ / ٣٠٣)

نبی رحمت ﷺ کی ازواج مطہرات کے ساتھ خاطر داری

دوسرے خاندان، دوسرے محلہ اور دوسرے افراد کی تربیت میں پلی بڑھی ایک عورت نکاح کے بعد ایک ایسے اجنبی ماحول میں آجاتی ہے، جہاں ہر چیز نامانوس اور ہر چہرہ نیا ہوتا ہے، ازسرِنو زندگی کا آغاز ہوتا ہے، ساتھ ہی ساتھ اعزاء واقرباء کی یاد بھی تروتازہ رہتی ہے، ایسے وقت میں دلداری اور خاطر داری کی سخت ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے شادی کے بعد اپنے گھر کے ماحول سے مانوس کرنے کے لئے ان کی دل جوئی کے ساتھ ساتھ ان کی خاطر داری بھی کی، اور محبت کی انوکھی مثال قائم کر کے پوری انسانیت کو ایک بہترین اسوہ عطا کیا چنانچہ حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا خود فرماتی ہیں: ''میں آپ ﷺ کے یہاں گڑیوں سے کھیلا کرتی تھی اور میرے ساتھ میری سہیلیاں بھی ہوتی تھیں، جب رسول اللہ گھر میں داخل ہوتے، تو وہ شرماتیں اور پردہ میں داخل ہوجاتیں، آپ ﷺ نہیں میرے پاس بھیج دیتے تو وہ میرے ساتھ کھیلتیں'' (بخاری، باب الانبساط الی الناس، حدیث نمبر: ٦١٣٠) اور ایک جگہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: کہ رسول اللہ ﷺ میرے دروازے پر کھڑے تھے اور حبشہ کے لوگ نیزہ بازی کررہے تھے، آپ ﷺ نے اپنی چادر میں مجھے چھپالیا؛ تاکہ میں آپ ﷺ کے کانوں اور گردن کے درمیان سے ان کا کھیل دیکھ سکوں، آپ ﷺ میری وجہ سے کھڑے رہے، یہاں تک کہ میں خود لوٹ آئی۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ٢٥٣٣٣) لیکن جب ہم اپنے ماحول پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو دلجوئی اور خاطر داری تو کجا؟ سسرال میں ماحول سے مناسبت کا لحاظ کئے بغیر طعنے کسے جاتے ہیں، غربت ومفلسی، اور والدین کو برا بھلا کہا جاتا ہے، اس سلسلے میں ہمارا معاشرہ اسلامی تعلیمات سے یکسر مختلف ہوچکا ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ زوجین تعلیمات نبوی کے دائرے میں زندگی گزارنے کی کوشش کریں جس سے معاملات کافی بہتر ہوسکتے ہیں۔

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نان ونفقہ کی ادائیگی میں طرزِ عمل:

ازدواجی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد اپنی شریک حیات کا نان ونفقہ مرد پر شریعت نے لازم کیا ہے، لیکن جب ہم اپنا جائزہ لیتے ہیں تو بہت سارے افراد ایسے نظر آئیں گے، جن کی شریک حیات میکہ سے خرچ منگا کر گذارا کرتی ہیں، افسوس دیکھنے میں یہ بھی آیا کہ گھر کا خرچہ بلکہ مرد کا ذاتی خرچہ بھی میکہ سے لیا جاتا ہے، منع کرنے کی صورت میں طلاق کی دھمکی دی جاتی ہے، جس کے نتیجے میں ایسی مظلوم عورتیں ذہنی دباؤ کی الجھن کا شکار ہوکر خودکشی اور غلط کاری جیسے جرائم پر مجبور ہوجاتی ہیں، جبکہ نبی کریم علیہ السلام سے ثابت ہے کہ اپنی ازواج مطہرات کا نفقہ قبل از وقت دے دیا کرتے تھے، ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بنونضیر سے جو مالِ غنیمت آتا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے خاص تھا اور آپ اس مال سے اپنی ازواج پر مکمل سال خرچ کیا کرتے تھے۔ (مسلم، باب حکم الفئ، حدیث نمبر:۱۷۵۷) کاش!! ایسے افراد ذرا تعلیمات نبوی پر غور کرتے، کاش! اسوۂ حسنہ سے آراستہ ہوتے، کاش! اسلام کی پاکیزہ تعلیمات سے بہرہ ور ہوتے اور معاشرے کو بہتر بنانے میں اپنا کردار ادا کرتے۔

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ازواج مطہرات کے مابین عدل

مسلم معاشرہ کا اگر جائزہ لیا جائے تو روز افزوں انحطاط کا شکار ہے جس میں بہت سے ایسے افراد ہیں، جو حق زوجیت میں ناکام اور عدل وانصاف کے معیار سے کوسوں دور ہیں، معاشرہ میں اپنے ماں باپ اور اپنی بیوی کے درمیان عدل کا فقدان بہت تیزی سے بڑھتا جارہا ہے، کہیں اولاد والدین کو وہ رتبہ دیتی ہے کہ وہ اپنی بہو کو بیٹے کی شریک حیات کی حیثیت ایک لونڈی سے زیادہ نہیں سمجھتے، تو وہیں دوسری طرف اولاد زن مریدی کی ایک ایسی مثال بھی قائم کرتی ہے کہ بیوی کو سرآنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے اور صداقت کا سارا معیار بیوی کو سونپ کر والدین کو مجرم بنایا جاتا ہے، بے حرمتی کے ساتھ گھر سے بے گھر کیا جاتا ہے، دونوں جانب غلطی ہوتی ہے اور جو مرد ایک سے زائد بیویاں رکھتے ہیں تو وہ بھی ان کے درمیان عدل کا معاملہ نہیں کرتے، رہائش اور آسائش میں، کپڑے اور کھانے میں، باری اور حقوق کی ادائیگی میں عدم توازن اور عدل کی کمی موجودہ زمانے کا خطرناک المیہ بن چکا ہے جو مغربی تہذیب سے مرعوبیت اور محبت کا ایک بڑا خمیازہ ہے، کاش!! ایسے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل سے سبق لیتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان فرامین پر توجہ دیتے، عدل کے معیار کو قائم کرتے، خود آپ علیہ السلام کی نو بیویاں تھیں؛ لیکن کسی کو یہ شکایت کبھی نہیں ہوئی کہ آپ ہمارے درمیان عدل نہیں کرتے، ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: كان رسول الله لا يفضل بعضنا على بعض في القسم من مكثه

عندنا۔ ”رسول اللہ ہمارے پاس ٹھہرنے کی تقسیم میں کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دیتے تھے“۔

(ابوداؤد، باب فی القسم بین النساء، حدیث نمبر: ۲۱۳۷)

حتی کہ ایک بیوی کی باری میں دوسری بیوی سے مس تک گوارا نہیں فرماتے، آپ کا یہ عدل ان چیزوں (باری، کھانا، کپڑا، رہائش، حقوق کی ادائیگی وغیرہ) میں تھا جس کی آپ قدرت رکھتے تھے، غیر مقدور چیزوں کے سلسلہ میں آپ خود دعاء فرماتے تھے: اللّٰھم ھذا قسمی فیما املک، فلا تلمنی فیما تملک و لا املک۔ ”اے اللہ! اس چیز میں یہ میری تقسیم ہے، جس پر میں قدرت رکھتا ہوں، آپ اس چیز پر میری ملامت نہ کیجئے، جس پر آپ قدرت رکھتے ہیں، میں نہیں“۔

(السنن الکبریٰ للبیھقی، باب ما جاء فی قول اللہ عز وجل: ولن تستطیعوا أن تعدلوا بین النساء......: ۱۵۱۴۲)

بیویوں کے درمیان عدل نہ کرنے کی صورت میں نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخت وعیدیں وارد ہوئیں ہیں آپ کا فرمان عالی ہے: من کانت لہ امرأتان، فمال الی أحدھما، جاء یوم القیامۃ، و شقہ مائل

”جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں سے ایک کی طرف جھک جائے تو وہ قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ اس کا ایک پہلو گرا ہوا ہوگا“۔ (سنن الدارمی، باب فی العدل بین النساء، حدیث نمبر: ۲۲۰۶)

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عورت کی رائے کا احترام

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورت کی رائے کو بہت اہمیت دی ہے اور وقتاً فوقتاً موقع کی نزاکت سے عورت کی رائے کا احترام نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے اور اہم امور پر اپنی ازواج مطہرات سے تبادلہ خیال اور مشورہ کا ذکر احادیث مبارکہ میں پایا جاتا ہے، صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے باوجود بھی صحابہ رضی اللہ عنہم نے حلق نہیں کرایا تو حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا نے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مشورہ دیا کہ آپ خود حلق فرمالیں اور ہدی کے جانور بھی اللہ کی راہ میں قربان کردیں، نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ام المومنین ام سلمہؓ کی رائے کو اہمیت دی اس پر عمل کیا، جب صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حلق کراتے ہوئے اور ہدی کے جانور اللہ کی راہ میں قربان کرتے ہوئے دیکھا تو صحابہؓ نے بھی بلا چوں و چراں حلق کرالیا اور اپنے ہدی کے جانور ذبح کئے۔ (بخاری، باب الشروط فی الجھاد، حدیث نمبر: ۲۷۳۲)

کیا ہم اپنی اہلیہ کی کسی بات کو اہمیت دیتے ہیں؟ کیا ان کی رائے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں؟ اگر غور کیا جائے تو ہماری روش اور ہمارے افعال طرزِ نبوت سے مختلف اور جداگانہ ہیں، نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرزِ عمل ہمیں بتا رہا ہے کہ عورت کی ہر بات قابلِ رد نہیں ہوا کرتی۔ اس میں ہی دنیا و آخرت کی فوز و فلاح بھی مضمر ہوتی ہے۔

اصلاحی مضامین

مساجد کی آبادی ہر مسلمان کی ذمہ داری

از: مولانا محمد عمر قاسمی کاماریڈی*

اسلام کی تعلیمات ہمہ گیر اور ہدایات عالمگیر اور آفاقی ہیں، جس نے بندگان خدا کو خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت و بندگی اور اطاعت و فرماں برداری کا پابند کیا؛ اسی لئے ایک بندۂ مؤمن اپنے معبودِ حقیقی و مسجودِ اصلی کے سامنے اپنی عاجزی و بےبسی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے سرِ تسلیم خم کرتا ہے، جو کہ درحقیقت ایک گم شدہ بندے کے اپنے آقا کے دربار میں حاضری کا سبق ہے، اور اس حقیقت کی خوبصورت ترجمان اور بہترین شکل نماز ہے، "نماز" اسلام کا مہتم بالشان رکن اور بنیادی ستون ہے، جو ایمان و کفر کے مابین حد فاصل اور خطِ امتیاز ہے، جس کی ادائیگی ہر صاحبِ عقل، بالغ مسلمان پر فرض و لازم ہے اور اس کی ادائیگی کے لئے شریعت مطہرہ نے ایک مخصوص و مقدس مقام بنایا ہے، اور وہ مقدس و پاکیزہ جگہ شریعت کی اصطلاح میں "مسجد" کہلاتی ہے، مسجد درحقیقت پروردگار عالم کا بابرکت گھر اور پر عظمت دربار ہے، خیر و برکت کا منبع اور نور و ہدایت کا سرچشمہ ہے، عبادت و بندگی کا مظہر اور اسلام کی نشر و اشاعت کا مرکز ہے، امن و سلامتی کا گہوارہ اور رحمت و برکت کی منزل ہے، اور ملائکہ کا مسکن اور اسلام کی عظیم درسگاہ ہے؛ یہی وجہ ہے کہ مسجدیں ہر علاقے اور ہر بستی کی وہ بنیادی ضرورت ہے، جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں، اور اس کا کوئی نعم البدل بھی نہیں، اس کا ادب و احترام ہر صاحبِ ایمان پر لازم و واجب ہے؛ کیوں کہ اس کی حیثیت اور مقام دیگر جگہوں سے بلند و بالاتر ہے۔

مساجد کی فضیلت:

مسجد خانۂ خدا اور خیر البقاع (دنیا کی بہترین جگہ) ہے، کتاب وسنت میں بیشتر مقامات پر اس کی فضیلت وعظمت وارد ہوئی ہیں: چنانچہ "مسجد اللہ کا گھر ہے، مسجد آسمان والوں کو ایسے ہی چمکتے اور روشن نظر آتی ہے، جس طرح زمین والوں کو آسمان کے ستارے چمکتے نظر آتے ہیں"۔ (مجمع الزوائد: ۴/۱۹۳)

خطۂ ارض پر عنداللہ محبوب ترین جگہیں "مساجد" ہیں؛ جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے کہ "(مساجد) جنت

* فاضل دارالعلوم دیوبند

کے باغ ہیں، اللہ تعالیٰ کی نظر میں روئے زمین پر سب سے بہترین جگہیں مسجدیں ہیں اور سب سے بدترین جگہیں بازار ہیں‘‘(مسلم باب فضل الجلوس فی مصلاہ:۶۷۱)

صرف یہی نہیں؛ بلکہ مسجد امن وسلامتی کا گہوارہ ہے، ہر مؤمن متقی کا گھر ہے؛ نیز جماعت کی نماز منفرد کی نماز سے ۲۷ درجہ ثواب زیادہ رکھتی ہے۔(بخاری ومسلم،مشکوٰۃ:۱۰۵۲)

لہٰذا ہر صاحبِ ایمان شخص کو چاہیے کہ پنج وقتہ فرض نمازوں کا اہتمام کریں اور ان کی ادائیگی کے لئے مسجدوں کا رخ کریں۔

مساجد کی آبادی اور حاضری کی فضیلت:

کتنا خوش نصیب اور نیک بخت ہے وہ مسلمان جس کو باری تعالیٰ نے نماز کی ادائیگی اور مسجد میں حاضری کی توفیق ارزانی فرمائی ہے، یہ صرف فضیلت ہی نہیں بلکہ بہت بڑی سعادت بھی ہے؛ اس لئے کہ حدیث مبارکہ میں ہے: ’’اللہ تعالیٰ مسجد میں آنے والے بندے سے اس طرح خوش ہوتے ہیں، جس طرح گم شدہ آدمی کے ملنے سے گھر والے خوش ہوتے ہیں؛ نیز یہ کہ مسجد میں آنے والے کی اللہ ربّ العزت والجلال خود میزبانی اور مہمان نوازی کرتے ہیں؛ گویا مسجد میں آنے والا اللہ کا مہمان بن جاتا ہے۔(بخاری: باب فضل من غدا الی المسجد:۶۳۱)

مسجد میں پیہم حاضری اور آمد ورفت کمال ایمان کی نشانی اور متقی شخص کی علامت ہے:

اللہ تعالیٰ اس (مسجد میں آنے والے) بندے سے محبت فرماتے ہیں، اور ملائکہ اس کے معاون و مددگار بن جاتے ہیں۔(مسند احمد:۴۹۱۴)

نیز اکثر وقت مسجد میں گذارنے والے بندہ کو بشارت دیتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ ’’صبح وشام مسجد میں حاضر ہونے والا گناہوں اور خطاؤں سے اس طرح منزہ ومبرہ ہوجاتا ہے، جس طرح اس وقت تھا، جب ماں کی پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔‘‘(مسلم:۶۶۶)

اور مسجد میں آنے والا کبھی خیر سے محروم نہیں رہتا؛ کیوں کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ’’مسجد میں بیٹھنے والا تین فائدوں میں سے ایک فائدہ ضرور حاصل کرتا ہے۔(۱) کسی بھائی سے کوئی دینی فائدہ ہوجاتا ہے۔ (۲) یا کوئی حکمت کی بات سننے کو ملتی ہے۔(۳) یا اللہ کی رحمت مل جاتی ہے،(جس کا ہر مسلمان منتظر رہتا ہے) (مسند احمد:۴۹۱۴)

بہ ہر حال مسجد میں بیتنے والا وقت بھی قیمتی ہوجاتا ہے اور آدمی کسی نہ کسی خیر سے مالا مال ہوجاتا ہے؛ لیکن

مساجد کی آبادی بھی خدائے بزرگ وبرتر کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "اللہ کی مسجدوں کو وہی آباد کرتے ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں اور نمازوں کے پابند ہوں اور زکاۃ دیتے ہوں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں، توقع ہے کہ یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں"۔ (سورۃ التوبۃ:۱۸)

مساجد کی آبادی کی ترغیب دیتے ہوئے محبوب کل جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ "جب تم جنت کے باغوں سے گزرو تو خوب چرو، سوال کیا گیا کہ: جنت کے باغ کیا ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: مساجد۔"

(سنن الترمذی، ابواب الدعوات، ۲/۱۹۱)

مختصر یہ کہ ہر فردِ مؤمن کو اس بات کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہنا چاہئے کہ وہ ان سب فضائل وبرکات سے مستفید ہو۔

مسجد سے بے التفاتی وبے توجہی کا نقصان:

مسجد میں بکثرت آمد ورفت کمالِ ایمان کی نشانی ہے اور نہ آنا نفاق کی علامت ہے؛ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کہ کائنات میں سب سے بڑھ کر رحیم وبردبار ہے، "مسجد میں نہ آنے والوں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ ارادہ فرماتے ہیں کہ ان کے گھروں کو جلادوں"۔ (بخاری: کتاب الجماعۃ والامامۃ: ۶۱۸) ذرا اندازہ لگائیے کہ کتنی بڑی بات ہوگی اور کیا عظمت ہوگی مسجد کی کہ جس میں نماز باجماعت کی کوتاہی پر اس قدر ناراضگی کا اظہار فرمارہے ہیں، پس مسجد میں حاضری کی اہمیت کو سمجھنے کی ضرورت ہے؛ لیکن یہ بات بھی مہتاب نیم شب کی طرح عیاں ہے کہ ابتدائے آفرینش سے ہی حق وباطل کا تصادم اور ٹکراؤ جاری رہا ہے کہ ہر زمانے میں دشمنانِ اسلام اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں، کبھی تو احکامِ شریعت میں ترمیم اور تبدیلی کرکے، تو کبھی شعائر اسلام کا استہزا اور مذاق بناکر، کبھی تو اذانوں پر پابندیاں لگاکر، کبھی مسجدوں کی بے حرمتی وتقدس پامالی کرکے؛ لیکن یاد رکھیں کہ یہ سب ہمارے شامتِ اعمال اور دین سے دوری کا نتیجہ اور اثر ہے، پس ہمارے ملک ہندوستان میں سب سے پہلے بابری مسجد کو ہدف بنایا گیا، اور ناجائز قبضہ کرکے اس کو مندر میں تبدیل کیا گیا، اسی کی ترجمانی کرتے ہوئے اویس زمانہ قاری سید صدیق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح کہا تھا

وہ میر باقی کی تھی جو مسجد جو عہد بابر کی تھی نشانی
خدا کا گھر وہ گرا کے ظالم یہ کیسا مندر بنا رہے ہیں

لیکن پھر بھی جب تک ظالم کی آتشِ ظلم ٹھنڈی نہ ہوجائے تو وہ کچھ نہ کچھ شر انگیزی ضرور کرتا رہتا ہے، ابھی سال دو سال قبل شہر حیدرآباد میں بھی دو مسجدوں کی بے حرمتی کی گئی، اور ان کو مسمار کردیا گیا، اس طرح کے اور بھی

واقعات رونما ہوئے ہیں یہ سب ہماری شامت اعمال کا نتیجہ اورقرب قیامت کا قرینہ ہے، ہم سے صرف بابری مسجد ہی نہیں چھینی گئی ؛ بلکہ بابری مسجد تو ہدف اورنشانہ ہے، اس کے علاوہ دلی کی جامع مسجد، حیدرآباد کی مکہ مسجد وغیرہ بھی نشانے پر ہے، وقفہ وقفہ سے دشمن ہماری رگِ غیرت وحمیت کو بھڑکاتے رہتے ہیں، یکے بعد دیگرے مسجدوں پر ناپاک حملے کیے جاتے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم تو بس نام کے مسلمان رہ گئے ہیں، خود" مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے" ہمارا طرزِ عمل تو محض رمضانی مسلمان ہونے کا واضح ثبوت پیش کرتا ہے، جیسے ہی رمضان آجائے، تو مسجد میں آمدورفت شروع ہوجاتی ہے، قرآن کی تلاوت کا خوشگوار ماحول پیدا ہوجاتا ہے، روزوں کے اہتمام کی خوشبودار فضا چلنے لگتی ہے، تسبیحات کی پابندی کے دلچسپ مناظر نظر آتے ہیں، غریبوں کی امداد، مسکینوں کی دادرسی، بیماروں کی مزاج پرسی ؛ بلکہ ہر اعتبار سے انسانیت نوازی اور خدمت خلق جیسی نمایاں صفات کا ظہور ہوتا ہے، خیر خواہی کے جذبات ابھرنے لگتے ہیں، ہم دردی کے حوصلے پروان چڑھنے لگتے ہیں ؛ لیکن پھر جوں ہی ہلالِ عید نظر آجائے، تو دفعتہ ماحول بدل جاتا ہے، مزاج میں تبدیلی آجاتی ہے، بہار کے بجائے خزاں جیسا ماحول پیدا ہوجاتا ہے، اور درپردہ چھپے ہوئے سب شرور وفتن عود کر آجاتے ہیں، مسجدوں سے بیگانگی و بے التفاتی، نمازوں کی غفلت و لاپرواہی کا ایسا منظر ہوتا ہے، جو ناقابل بیان ہے ؛ شاعر مشرق علامہ اقبال نے امت کی اسی زبوں حالی کا رونا رویا ہے:

مسجد تو بنادی شب بھر میں، ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا

اب بھی وقت ہے سدھر جانے کا، مزاجوں کو بدلنے کا، عادات کا رخ موڑنے کا، تو اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں ان حالات میں ہوش کے ناخن لینے کی ضرورت ہے، اولاً تو ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم خاموش رہنے کے بجائے جائز اور جمہوری حدود میں رہتے ہوئے اس کے خلاف آواز بلند کریں، ثانیاً ہمیں خود اپنے طور پر مسجدوں کو آباد کرنے کی فکر کرنی چاہیے؛ اس لیے کہ جب تک ہماری مسجدیں آباد اور نمازیوں سے پر ہوں گی، تو کسی میں بھی اتنی جرأت وہمت نہیں کہ وہ اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکے، اور اس کے خلاف اپنے ذہن کو دوڑا سکے ؛ لیکن ہمارا حال تو یہ ہوگیا ہے کہ مسجدوں کی کوئی فکر ہے نہ نمازوں کا شوق، اور جب مسجدوں پر حملے اور انگشت نمائی ہوتی ہے، اور اس کی بے حرمتی کی جاتی ہیں، تو تب کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ باقی نہیں رہ جاتا، پھر ہائے ہائے کرنا کچھ نفع بخش اور سودمند نہیں ہوتا، اس لئے ہماری اولین ذمہ داری ہے کہ ہم خود محلہ واری سطح پر مسجدوں کو آباد کرنے کی فکر کریں، آپسی اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مسلمان بھائیوں سے ترغیب اور

تشویق کی باتیں کر کے انہیں مسجد کا پابند بنائیں، جس طرح مسجد کی تعمیر اور آبادکاری باعثِ سعادت اور اجرو ثواب کا موجب ہے، بس یوں ہی اس کے برخلاف مسجد ڈھانا اور تخریب کاری و ویرانی کے اسباب و ذرائع کو پیدا کرنا بدبختی و حرماں نصیبی ہے، جو سنگین گناہ اور ظلم عظیم ہے؛ جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے: "وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ"

خلاصۂ تحریر:

مختصر یہ کہ ہم قرآنی پیغام "اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ" کا عامل بنتے ہوئے اپنے مؤمن کامل ہونے کا ثبوت دیں اور مساجد کی حفاظت کا سب سے بہترین طریقہ یہی ہے کہ اس کی آبادی کی کوشش کی جائے، اس کے بے شمار فوائد وثمرات ہیں، ہر شخص کو شعوری طور پر یہ کوشش کرنا چاہیے کہ وہ جس علاقے میں رہتا ہے، اگر وہاں مسجد نہ ہو تو مسجد کی تعمیر کی فکر کریں، اور اگر ہو تو اس کی آبادی کی کوشش کرے، اسی طرح ہر نمازی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی انفرادی و اجتماعی دعاؤں میں مسجد کی آبادی اور علاقے کے لوگوں کے لئے دعا کریں کہ پروردگارِ عالم ہر مسلمان کو پکا نمازی اور سچا دین دار بنائیں، اور مساجد کے آئمہ و مؤذنین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے آپ کو اذان و نماز تک محدود رکھنے کے بجائے مسجد کی آبادی کی بھی کوشش کرے، اپنے آپ کو اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہ سمجھیں؛ بلکہ یہ بھی ان کے فریضہ میں داخل ہے۔

اللہ تعالیٰ توفیقِ عمل نصیب فرمائے۔ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

افاداتِ اکابر

اشرف المجالس

ترتیب وپیش کش: مفتی محمد احمد علی صاحب قاسمی*

مخدومنا ومحبوبنا حضرت مولانا محمد عبد القوی صاحب مدظلہ العالی ہر جمعہ بعد نمازِ عصر ہفتہ واری اصلاحی مجلس میں حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے "منتخب ملفوظات" (مرتبہ حضرت مولانا یحییٰ نعمانی زید مجدہٗ) کی تعلیم فرماتے ہیں، اُن ملفوظات کی توضیح وتشریح کو برادرِ عزیز حافظ مولانا مفتی احمد علی قاسمی زید فضلہٗ نے ضبط وترتیب دیا ہے۔ از مرتب

(۱) دین میں کمال اہلِ دین کی صحبت سے پیدا ہوتا ہے:

ارشاد فرمایا: دین میں کمال اہلِ دین کی صحبت سے ہے، زیادہ تاثیر صحبت کی ہے، اگر یہ متعذر ہو جائے تو دوسری شکلیں ہیں، صحبت اصل ہے؛ اس لئے کہ صحابہؓ کو کمالِ دین صرف صحبت سے حاصل ہوا ہے، کسی صحابیؓ کے لیے وہ القاب نہیں جو بعد کے لوگوں کے لیے ہیں، بعد کے لوگ ان القاب کے محتاج ہیں، صحابہؓ کو صحبت نبی کے بعد کسی لقب کی حاجت نہیں رہی کہ انہیں مفسر، محدث، علامہ اور فلاں فلاں کہا جائے، تھے تو وہ سب کچھ لیکن ان کو اِن القاب کی ضرورت نہیں تھی، بعد والوں کے تعارف کے لیے بیسیوں القاب ہیں؛ لیکن صحابہؓ کا واحد تعارف صحابیؓ ہے، وہ نبی کی صحبت پائے ہوئے ہیں، خواہ ایک دن کے لیے ہی کیوں نہ ہو، اسی ایک دن نے ان کو دین کے جس کمال پر پہنچایا وہ کمال بعد کے لوگوں کو ہزاروں برس کے ریاضت ومجاہدے سے حاصل نہیں ہوسکتا، تو اصل چیز صحبت ہے، صحبت یا بہ صورتِ مجبوری مکاتبت کا مقصد رابطہ ہے، رابطہ کامل رہے گا اور تازہ رہے گا تو ترقی بھی ہوتی رہے گی، رابطے میں اگر خلل آئے گا تو ترقی بھی لولی لنگڑی ہو جائے گی، رابطہ ٹوٹے گا تو وہ سالک کو توڑ کے رکھ دے گا، یہ غیبوبت، غفلت دوری اتنی بڑھتی جائے گی کہ کفر وعناد اور سرکشی تک پہنچ جائے گی، اس لیے رابطہ ٹوٹ جائے تو ٹوٹنے کا غم بھی مت کرو، رابطے کو جوڑنے میں جلدی کرو، فوراً اس کو جوڑ دو، بس اس کی فکر زیادہ کرو کہ جوڑنے میں دیر ہونے نہ پائے، کیوں کہ یہ رابطۂ شیخ ومربّی بہت کام کی چیز ہے۔

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

(۲) بندہ بن کر رہو، بندگی کی شان اپناؤ:

ارشاد فرمایا: سب تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ بس بندہ بن کر رہو، کسی مرتبے کے متمنی نہ ہوں، بندگی سے بڑا کون سا مقام ہے؟ یہی تو سب سے بڑا مقام ہے جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا اشھد ان محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ میں عبدیت کا ذکر مقدم ہے ورسولہ سے، سب سے بڑا مقام عبدیت ہے، عبدیت کا کمال ہی ان کو رسالت تک پہونچایا، لیکن رسالت اختیاری چیز نہیں؛ وہ وہبی اور عطائی ہے، اور اب تو اللہ تعالیٰ نے کسی کو عطا نہ فرمانے کا ارادہ کرلیا ہے، بتا یہ رہا ہوں کہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب وآخری نبی کے لیے پسند کی وہ عبدیت ہے، چناں چہ اُن کی صفات میں جو سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز صفت تھی وہ عبدیت اور بندگی کی صفت تھی، پوری زندگی بندہ بن کر گزاری، پس ہمارے لئے بھی کمال کی کوئی صفت ہوسکتی ہے تو وہ عبدیت وبندگی کی صفت ہی ہے، اس سے بڑا کوئی کمال نہیں ہے، ہم لوگوں کو یہ دھوکہ ہوگیا کہ ہم فلاں بننا چاہتے ہیں فلاں بننا چاہتے ہیں، لیکن بندہ بننا نہیں چاہتے، اس کی آج بہت کمی ہے اور باقی سب تو ماشاء اللہ ٹھیک ہی ہے۔ طریقت میں کمال حاصل کرنا، سلوک طے کرنا، سب کا مقصد بندہ بننا ہے، بس ہم بندے بن جائیں، بندے کیسے بنتے ہیں؟ اپنے شیخ سے معلوم کرتے جاؤ بنتے جاؤ، معلوم کرتے جاؤ بنتے جاؤ، ایک دن بندے بن جائیں گے اور اللہ تعالیٰ راضی ہوجائے گا۔

(۳) حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقام علمی وروحانی:

ارشاد فرمایا: حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تصوف وسلوک کے اعلیٰ مراتب ومقامات کو حاصل کرنے کے سلسلہ میں کافی استفادہ کیا تھا، پہلی بار جب اپنے والد صاحب کے ساتھ حج کے لئے گئے تھے اس وقت بھی، پھر بعد میں مستقل ان کی خدمت میں رہنے کے ارادے سے بھی جا کر استفادہ کیا، اور ہندوستان کے اکابر میں اپنے شیخ کے بعد سب سے زیادہ عقیدت آپ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے رکھتے تھے، اور ان کے بہت زیادہ معتقد تھے؛ بلکہ خود فرماتے تھے کہ میں اُن کو اپنے شیخ کی طرح سمجھتا ہوں، ان کے یہاں بھی جاتے تھے، اور استفادہ کرتے تھے، اس لیے علمی اعتبار سے تحقیقی شان بنی، اور حاجی صاحب کی برکت سے روحانیت بھی کافی پروان چڑھی، اس آخری دور میں سلف کے محقق علماء ومشائخ کی شان اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی تھی، اس لئے اُن سے بالخصوص اہلِ علم کو فائدہ اُٹھانے کی ضرورت ہے۔

(۴) شریعت کے احکام دو طرح کے ہیں:

ارشاد فرمایا: شریعت کے احکام کے دو درجے ہیں، ایک درجہ بہت اعلیٰ ہوتا ہے، اس میں مشقت زیادہ ہوتی ہے، اس مشقت کو جھیل کر اسی طرح کام کیا جائے تو اس کو ''عزیمت'' کہتے ہیں، اور ایک درجہ اس کا ہلکا ہوتا ہے جس میں مشقت کم ہوتی ہے (یعنی ایسا نہیں تو ایسا بھی کر سکتے ہیں) یہ سہولت والا راستہ ہے، اس کو شریعت میں ''رخصت'' کہا جاتا ہے، عزیمت ہمت کر کے اعلی درجے پر عمل کرنا اور رخصت زیادہ ہمت نہ ہو سکی تو ادنیٰ درجے پر عمل کر لینا، اللہ تعالیٰ کے یہاں دونوں برابر ہیں، لیکن بندے کے لیے ایک میں مشقت و مجاہدہ زیادہ ہے، ایک میں کوئی خاص مجاہدہ نہیں ہوتا، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اپنا معمول اور مزاج یہ تھا کہ ایسے امور میں جہاں دونوں صورتیں جائز ہوں اگر چہ کہ عزیمت اعلیٰ درجے کی چیز ہے؛ لیکن حضرت رخصت والے راستے کو پسند کرتے تھے، کسی نے آپ سے سوال بھی کیا کہ جو اہل اللہ اور بڑے درجے کے لوگ ہوتے ہیں وہ ہمت جتاتے ہیں، عزیمت والے پہلو پر چلتے ہیں، رخصتیں عوام کے لیے چھوڑ دیتے ہیں اور آپ رخصتوں کو اختیار کرتے ہیں عزیمت کو چھوڑ دیتے ہیں؟ حضرت تھانویؒ نے اس کا جو جواب دیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگر سہولت دی ہے تو سہولت ہی پر کیوں نہ عمل کر لیا جائے، کیوں دعویٰ کر کے بڑی بڑی ہمتیں دکھائی جائیں، خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی رخصتوں پر عمل کرنا یہ عبدیت بندگی سے زیادہ قریب ہے۔ جب کہ حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیمت پر عمل کرنے سے جتنا خوش ہوتا ہے رخصت پر عمل کرنے سے بھی اتنا ہی خوش ہوتا ہے، تو خواہ مخواہ کا مجاہدہ کیوں کیا جائے؟ حدیث شریف میں ہے کہ کسی صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ سفر میں اگر ہمت ہو تو کیا پوری نماز پڑھ لی جا سکتی ہے؟ تو حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو دیا ہوا صدقہ ہے، اس کو خوشی سے لے لو، صدقة تصدق الله بها عليكم فاقبلوا صدقته (صحیح مسلم: ۲/ ۱۴۳) یعنی قصر ہی کر لو، خود آپ ﷺ کے سامنے اگر دو مشکلیں کھڑی ہو جاتی کہ کسی نہ کسی میں ابتلاء ضروری ہو جائے تو آپ ﷺ اھون (یعنی ہلکی مصیبت) کو اختیار فرما لیتے تھے۔ ما خير النبي ﷺ بين امرين الا اختار أيسرهما مالم يأثم۔ (بخاری: ۶۷۸۶)

(۳) غیر شرعی تقریبات میں شرکت:

ارشاد فرمایا: فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو آدمی قائد ہو اور اس مرتبے پر ہو کہ غیر شرعی امور میں اس کے ناراض ہونے سے لوگوں کی اصلاح ہوتی ہو تو اس کو غیر شرعی تقریبات میں شرکت کرنے سے بچنا چاہیے، لیکن ہما شما جن کا کوئی وزن اور اثر ہی نہیں پڑتا ان کو علماء سے پوچھ لینا چاہیے کہ ان کے لیے کیا مناسب ہے، اس لیے کہ بعض

منکرات وہ ہیں جن کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور بعض ایسے ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے دعوتوں میں شرکت کرنا جائز ہی نہیں، دونوں کا حکم الگ ہے، اس میں فرق کرنا چاہیے، اور کون آدمی ایسا ہے جس کو ایسی تقریبات میں شرکت قطعاً نہیں کرنا چاہیے، اور کون ایسا ہے کہ اس کے لئے شرکت ہی بہتر ہے، اس میں بھی فرق کرنا چاہیے، آدمی بدلتے ہیں احکام بدلتے ہیں، حالات بدلتے ہیں احکام بدلتے ہیں، اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ ایسی دعوت جس میں منکرات ہوں اس میں شرکت کرنے کا کیا حکم ہے؟ حضرت امام صاحبؒ نے فرمایا: جب تک میں مقتدا نہیں تھا تو شریک ہوجایا کرتا تھا اور جب سے مقتدیٰ بن گیا ہوں احتیاط کرتا ہوں۔ یہی تفقُّہ ہے، اس لئے اپنے احوال بتلا کر اپنے شیخ سے مشورہ کرلیا کریں بشرطے کہ وہ عالم ہو، ورنہ کسی عالمِ باعمل سے معلوم کرلیں، کیوں کہ کبھی قطع تعلق اور رشتے ٹوٹنے کی نوبت آجاتی ہے جو تحمُّلِ منکر سے اشد گناہ ہے۔

(۶) ضرورت سے زائد بولنا دینی اعتبار سے ہلاکت کا سبب ہے:

ارشاد فرمایا: حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے، میرے نزدیک اس زمانے کے مہلکات میں ایک بڑا مہلکہ قول کا اپنی مقدار سے بڑھ جانا ہے، یعنی ضرورت سے زیادہ باتیں کرنا، ضرورت سے زیادہ باتیں کرنے کو ''مہلکات'' میں شمار کیا ہے، بہت بولنا دینی اعتبار سے ہلاکت کی بات ہے، اور تجربہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو زیادہ علم دیتے ہیں وہ کم بولتا ہے، اور جس کے پاس سطحی معلومات اور نالج کی بہتات ہوتی ہے وہ بہت زیادہ بولتا رہتا ہے، علماء نے اس کی مثال یہ دی ہے کہ سمندر میں جہاں گہراؤ ہوتا ہے وہاں سناٹا اور خاموشی طاری رہتی ہے، اور ساحل پر چوں کہ پانی کی مقدار بہت کم ہوتی ہے وہاں شور ہوتا ہے، تو یہاں سطحی پن ہے اور جہاں ڈیپ ہے اور پانی بڑی مقدار میں ہے اس طرف دیکھو تو سمندر کی خاموشی کی وجہ سے ایک ہیبت طاری ہوجاتی ہے، تو پتہ چلا کہ علم زیادہ ہوگا تو خاموشی بڑھے گی اور علم گھٹے گا تو بولنا پڑے گا، دیکھو حضور علیہ الصلاۃ والسلام کو اولین وآخرین کا علم دیا گیا تھا؛ لیکن آپ بہت کم بولتے تھے، کان رسول اللہ ﷺ طویل الصمت اکثر خاموش رہتے تھے، جبکہ ساری دنیا کی ہدایت ان کے بولنے سے جڑی ہوئی تھی، بہرحال بہت بولنا جاننے کی علامت ہوسکتی ہے، لیکن صحیح جاننے کی علامت نہیں ہے۔

(۷) اللہ پاک کی نعمتوں کو بندہ بن کر استعمال کرنا چاہیے:

ارشاد فرمایا: حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب دامت برکاتہم اکثر یہ جملہ فرمایا کرتے ہیں ''کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کو بندہ بن کر استعمال کرو، باغی بن کر استعمال مت کرو'' اور آج یہی صورتحال دیکھنے کو ملتی ہے کہ کچھ لوگ

اللہ پاک کی نعمتوں کو بندہ بن کر استعمال کرتے ہیں، اور کچھ لوگ باغی بن کر۔ بندہ بن کر استعمال کرنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے کے مطابق استعمال کرے، غرور واستکبار نہ ہو، باغی بن کر استعمال کرنا یہ ہے کہ اپنے من اور نفس کے غلام ہو جائیں اور احکام کا کوئی احترام نہ ہو، غرور و گھمنڈ ٹپک رہا ہو، اللہ بچائے، غرور و بغاوت شریف لوگوں کا کام نہیں ہے۔

(۸) گناہ کے ساتھ قرب خداوندی حاصل نہیں ہو سکتا:

ارشاد فرمایا: گناہ زہر ہے، بہت سے گناہ آدمی بلا وجہ ہی کر لیتا ہے، اس میں کوئی لذت بھی نہیں رہتی، بعض گناہ ایسے ہیں جن میں وقتی لذت ہوتی ہے، تو جو لوگ ایسے گناہ کر لیتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ اس کو اس لذت کی لت پڑ گئی ہے، اس لیے وہ اس کو کر رہا ہے، بہت سے گناہ بے لذت ہیں ہم ہمت کر کے کم از کم یہاں سے اپنا کام شروع کریں کہ پہلے ایسے سب گناہوں کو چھوڑ دیں۔ حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک چھوٹا سا رسالہ لکھا ہے اس کا نام ہی ہے ''گناہ بے لذت'' اس کو تو کم سے کم ہم چھوڑ دیں، پھر اس کی برکت سے بقیہ گناہ چھوڑنا بھی آسان ہو جائے گا؛ لیکن دیکھو گناہ کے ساتھ اللہ کا قرب نصیب نہیں ہوتا، ہر گناہ اللہ سے دور کرنے کا کام کرتا ہے، قریب ہونے نہیں دیتا، گناہوں سے بچنے کی بہت ضرورت ہے۔

عورتوں کی صفتِ عفت سب صفات پر بھاری ہے

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

''آج کل عورتوں کے حقوق میں نہایت کوتاہی ہو رہی ہے جو بڑے ظلم اور بے دردی کی بات ہے، اپنی عفیف و شریف بیویوں کی چھوٹی چھوٹی بے تمیزیوں سے تنگ ہوتے ہیں اور تنگ ہو کر ان کے حقوق ضائع کرتے ہیں، بڑی بے سمجھی کی بات ہے یہ نہیں سمجھتے کہ جس قدر بے تمیز عورتیں ہیں سب عفیف ہیں، میں تو کہا کرتا ہوں کہ یہ ایک ہی صفت ایسی ہے کہ اس کے سامنے اور سب چیزیں گرد ہیں، اس عفت کی صفت میں ہندوستان کی شریف عورتیں حوریں ہیں، اگر ان کو گھر میں چھوڑ کر کہیں غائب ہو جاؤ اور اس حالت میں نہ تو ان کا خرچ دو نہ ان کی خبر لو نہ ان کو اپنی خبر دو لیکن اگر تم بیس برس کے بعد دفعۃً آ جاؤ تو جس کونے میں اس مظلومہ کو چھوڑ گئے تھے وہیں پڑی دیکھو گے''۔

(ماہنامہ دعوت الحق، ذوالحجہ ۱۴۴۵ھ ص:۱۲)

افاداتِ اکابر

ارشاد السالکین

''خانقاہِ سعیدیہ'' میں ہر شمسی مہینے کے دوسرے اتوار کو صبح ۹ ر بجے تا شب ۹ ر بجے اصلاحی مجلس منعقد ہوتی ہے، اس میں جنوبی ہند کی تمام ہی ریاستوں سے تقریباً تین سو سالکین شرکت کرتے ہیں، صبح ۱۰ تا ۱۲ ر بجے کی نشست میں شرکاء کے پوچھے گئے سوالات کے جواب مرشدی حضرت اقدس مولانا محمد عبد القوی صاحب مدظلہٗ العالی خود دیتے ہیں، جو بہت ہی نافع ہوتے ہیں، علماء وعوام سب ہی اس کے قائل ہیں، اس لئے مولانا مفتی محمد احمد علی صاحب قاسمی زید فضلہٗ استاذ ادارۂ ہذا و مجازِ حضرت والا نے اِن کو جمع کر کے قارئین کے فائدے کے لئے شائع کیا ہے۔ از مرتب

بچیوں کو بہ قدرِ ضرورت عصری تعلیم کافی ہے:

سوال (۱): میری بچی کا اس سال 12 ویں کا امتحان ہوا، الحمد للہ کامیابی حاصل ہوئی، آگے تعلیم جاری رکھیں یا اسی پر اکتفا کریں؟۔

جواب: بچیوں کے لیے تو بقدرِ ضرورت اتنی دنیوی تعلیم بہت کافی ہے، اب دین کی تعلیم کی فکر کیجئے، یہ تو ٹھیک ہے کہ لکھنا، پڑھنا، آنا چاہیے، اور بچپنے کے وقت سے فائدہ اٹھا کر یہ سب سکھا دینا بھی چاہیے، اچھا کیا آپ نے، لیکن اب جب کہ بارھویں تک تعلیم ہوگئی ہے تو اچھی خاصی عمر بھی ہو جاتی ہے، اب اس کے بعد بیٹی کو خطرے میں ڈالنا مناسب نہیں ہے، زیادہ پڑھا کے کریں گے بھی کیا؟ اب یہاں سے دینی تعلیم و تربیت کا انتظام کرو، اپنے گھر میں ہی اس کی اچھی تعلیم و تربیت ہو جائے، بہشتی زیور پڑھا دی جائے، قرآن تجوید کے مطابق پڑھا دیا جائے، عقائد اور تہذیب و اخلاق کی باتیں سکھائی جائیں، گھر گھرستی کی باتیں سکھائی جائیں، اور بقدرِ ضرورت اچھا پکا سکنے اور گھریلو امور انجام دینے والی بہو بنانے کے لیے ان سب باتوں کی تربیت کی جائے، یہ چیزیں اس کی زندگی میں خوشیوں کا سبب بنیں گی، یہ چیزیں سکھائے بغیر صرف سند ہاتھ میں دیکھ کر سسرال بھیجیں گے تو وہاں کیا اس کو سکون ملنے والا ہے؟ تو میرے خیال میں بارھویں تک تعلیم ایک اچھی شہری کی حیثیت سے اور ایک پڑھی لکھی سمجھدار عورت کی حیثیت سے جینے کے واسطے کافی ہے۔ اب اس کے دین کی فکر کرو، علم دین بھی

توبہ قدر ضرورت سیکھنا فرض عین ہے، اصولی طور پر اس کا نمبر پہلے تھا، اب بعد میں ہی سہی اس کی طرف توجہ کر لیں، یہ میرا مشورہ ہے، اور اگر کسی کے پاس اسباب ہوں اور وہ اعلیٰ تعلیم دلا کر لوگوں کے لئے نفع رساں (یعنی سماجی خدمت گزار) بنانا چاہتا ہے تو میرا مشورہ یہ ہے کہ یا تو اس کو ایجوکیشنلسٹ بنایئے، یا میڈیکل سائنس کروا کے ڈاکٹر بنا دیجئے؛ تا کہ عورتوں کے لیے بھی ایک اچھی خدمت گزار سماج میں موجود رہے، ایجوکیشنلسٹ اس لیے کہ بچیوں کو پڑھانے کے واسطے کام آئے گی، ورنہ بچیاں مرد ٹیچروں سے پڑھ رہی ہیں، ڈاکٹری اس لیے کہ دیندار عورتوں کے علاج کے لیے کام آئے گی، ورنہ بہت سی دین دار عورتیں بھی مردوں سے علاج کروانے پر مجبور ہیں، یہ سب باتیں اس وقت ہیں جب کہ بچی کی عفت کو کوئی خطرہ نہ ہو، اگر ماحول اور اسباب و وسائل ہوں اور عمر میں گنجائش ہو تو پڑھاؤ، ورنہ دیندار بنا کے شادی بیاہ کی فکر کرو۔

اگلی توبہ کو پہلی توبہ سے زیادہ باقی رکھنے کی کوشش کرو:

سوال (۲): میری خطرناک بیماری ہے غفلت اور ٹال مٹول، کبھی کوشش کر کے کام شروع بھی کرتا ہوں تو بہت جلد غفلت آجاتی ہے، پھر معمولات بھی پورے نہیں ہوتے، گناہ بھی سرزد ہو جاتے ہیں، کبھی احساس ہوا تو توبہ کر کے کام میں لگ جاتا ہوں۔

جواب: اس سلسلے کو جاری رکھو، مگر اس میں یہ کوشش کرتے رہو کہ توبہ کا یہ اثر ذرا لمبا چلے، پہلی دفعہ سے اگلی توبہ کا اثر ذرا زیادہ ہو، اس کی تو کم سے کم کوشش کرتے رہو، جب ہر دفعہ کی مدت کچھ لمبی ہوگی تو دھیرے دھیرے دیر تک گناہوں سے بچنے کی عادت پڑ جائے گی۔ یہ تو ممکن نہیں کہ گناہوں کے خیالات بھی نہ آئیں، مگر یہ بھی ٹھیک نہیں کہ آدمی جب چاہے توبہ توڑ کر گناہوں میں مبتلا ہو جائے، یہ تو سوائے نفس کی غلامی کے اور کچھ نہیں، یہ بہت غلط بات ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے، آپ اتنی تو کوشش کرو کہ پہلی دفعہ اگر ایک ہفتہ تک توبہ چلی تو دوسری دفعہ آٹھ دن تو چلے، نو دن تو چلے، کم از کم اتنی کوشش تو کرو، یہ طے کر لو کہ اس دفعہ کی مدت پچھلی دفعہ کے برابر بھی نہ ہوگی اور کم بھی نہ ہوگی، ہاں! اس سے زیادہ مدت تک قائم رہے، زیادہ صبر کریں گے، اور جب یہ مدت ختم ہونے لگے گناہ کا تقاضہ پیدا ہونے لگے گا تو اس وقت آپ کو اپنی ہمت فرسٹ گیئر میں ڈال لینا پڑے گا، اور زیادہ ہمت سے کام لے کر مدتِ تقویٰ کو اور آگے بڑھا لینا ہوگا۔ جو کوشش کرتا ہے ناکام نہیں ہوتا، من جد وجد اللہ کا یہ قانون سب انسانوں کے لیے ہے، اسی کا نام مجاہدہ ہے، اور اگر ہم یوں ہی بولتے رہیں گے کہ تھوڑے دن کام چل رہا ہے پھر نہیں چل رہا ہے تو بھائی یہ گاڑی کہیں بھی کھڑی ہو جائے گی کبھی آپ کو منزل تک نہیں لے جائے گی۔

ہر سالک کو چاہیے کہ اس کا نفس اس کو بہت ستا رہا ہے تو کم سے کم اتنی تو کوشش کرلے کہ تقوے کی پہلی میعاد سے اگلی میعاد بڑی رہے، اس سے کم بھی نہ ہو برابر بھی نہ ہو، کچھ نہ کچھ زیادہ ہی ہو۔

فضول کام میں لگے رہنا قلب کی بیماری ہے:

سوال (۳): احقر کو جمعیت خاطر نہیں رہتی ہے، یعنی ہمیشہ قلب کسی نہ کسی پریشانی یا کوئی نہ کوئی کام کے بارے میں سوچتا رہتا ہے، بالخصوص نماز میں دھیان اور توجہ نہیں رہتی۔

جواب: قلب کا کسی نہ کسی کام میں لگا رہنا یہ تو قلب کی زندگی ہے؛ لیکن فضول کام میں لگے رہنا یہ قلب کی بیماری ہے، من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیه (ترمذی:2317) تفکرات میں بھی لایعنی ہے، لایعنی تفکر الگ کرو، کام کے تفکرات تو بہت بڑی نعمت ہے، یہ انرجی ہے، اس سے طاقت آتی ہے اس سے اللہ کا قرب بڑھتا ہے، فکر تو رہنا ہی چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں آتا ہے کہ وہ ''دائم التفکر'' تھے، اب لوگ جو فکر کی باتیں کرتے ہیں وہ فکر و کر کچھ نہیں رہتی، خیال، منصوبے، پلان رہتے ہیں، نہ دنیا، نہ دین، ان منصوبوں سے کیا ملنے والا ہے؟ اس میں ٹائم ویسٹ کرنے کے بجائے اتنی دیر ذکر کرلو، اتنی دیر درود شریف پڑھ لو، ان اولی الناس بی یوم القیامة اکثرھم علیّ صلاۃ (ترمذی:484) بہت درود پڑھنے والا قیامت کے روز میرے قریب رہے گا، قرآن کی تلاوت کرو، فانه نور لک فی الارض وذخر لک فی السماء (مرقات شرح مشکوٰۃ:4866) قرآن کی تلاوت زمین کا نور اور آخرت کا ذخیرہ ہے۔ جمعیت خاطر کیا چیز ہے؟ اگر آپ جمعیت خاطر کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ دل دھیان میں کوئی بات ہی نہ آئے تو اس کا نام جمعیت نہیں ہے، جمعیت خاطر یہ ہے کہ آدمی اپنے منشا اور مقصدِ حیات پر دھیان لگائے رہے، بھائی! جو کام کرنا ہے اللہ کی رضا کے لئے کرنا ہے، اس کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہئے، پھر اس کی برکت سے دھیرے دھیرے آدمی کو ایک قسم کا اطمینان نصیب ہوجاتا ہے، یہی اطمینان جمعیت خاطر ہے۔ اب رہ گئ فکریں اور پریشانیاں تو اللہ والوں کو بھی یہ سب پیش آتا ہے، نت نئے مسائل ہیں، کوئی نہ کوئی الجھنیں، مصیبتیں لگی ہوئی ہیں، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا، اس لیے جو ضروری فکریں ہیں اس میں لگے رہیں، بال بچوں کی فکر میں، معاش کی فکر میں، اور دین پر ثبات اور استقامت کی فکر میں، یہ فکریں جمعیت کو متاثر نہیں کرتیں، روزی روٹی کی فکر میں نیت درست ہو تو وہ بھی ہمارے دین کو متاثر نہیں کرتی، چاہے اس کا اکثر وقت کسبِ معاش میں نکل جاتا ہو، تب بھی دین کو نقصان نہیں پہنچتا، رہ گیا نماز میں دھیان کا مسئلہ تو اس کا حل یہ ہے کہ نماز میں اپنے ارادے سے تو دوسری طرف دھیان نہ لے جائے، از خود چلا جائے تو اس کی کوئی پرواہ نہ کرے، بس اتنا کافی ہے۔

فقہ وفتاویٰ

آپ کے شرعی مسائل

از: مفتی محمد ندیم الدین قاسمی*

چار" قل" پڑھ کر قبر کے چاروں کونوں میں لکڑیاں گاڑنا

سوال: میت کے دفنانے کے بعد چار آدمیوں کا چار لکڑیوں پر ''چار قل'' پڑھ کر چاروں کونے میں گاڑنا کیسا ہے؟

جواب: ایسا کرنا قرآن وحدیث سے ثابت نہیں، اس لئے ایسا کرنا درست نہیں۔ (فتاویٰ قاسمیہ، ۳/ ۴۴)

غیر مسلم کو آیاتِ قرآنی سے تعویذ لکھ کر دینا

سوال: غیر مسلموں کو آیاتِ قرآنی سے تعویذ لکھ کر دینا کیسا ہے؟

جواب: آیاتِ قرآنی کے بہ جائے اعداد ونقوش کے ذریعہ سے تعویذ لکھ کر دینے کی تو گنجائش ہے، آیت لکھ دینے میں بے ادبی کا اندیشہ ہے، اور احتیاط کے خلاف ہے۔ (فتاویٰ قاسمیہ، ۳/ ۶۱۶)

برقعہ کے لئے کونسے رنگ کا کپڑا جائز ہے؟

سوال: برقعہ کے لئے کونسے رنگ کا کپڑا شریعت مطھرہ میں پہننا جائز ہے؟

جواب: ہر قسم کے رنگین کپڑے کا برقعہ پہننا جائز ہے، بہ شرطے کہ جاذب نظر نہ ہو، اصل چیز چہرہ سر وغیرہ ڈھانپنا ہے۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل، ۸/ ۵۵)

منھ بولے بیٹے سے پردہ

سوال: کیا منھ بولے بیٹے سے پردہ کرنا کیا ضروری ہے؟

جواب: شریعت مطہرہ میں منھ بولے بیٹے سے بھی پردہ کرنا ضروری ہے، کیوں کہ وہ اجنبی کے حکم میں ہے۔ (مستفاد از: آپ کے مسائل اور ان کا حل، ۸/ ۶۳)

متبرک ناموں والے کاغذات کا حکم

سوال: کاغذوں پر متبرک نام" محمد" اور" اللہ" لکھے ہوئے ہوتے ہیں، تو ان کو ضائع کرنا کیا طریقہ ہے؟

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

جواب: بہتر یہ ہے کہ ان کو جمع کر کے کسی ڈبے میں ڈالتے رہیں، اور پھر ان کو دریا برد کر دیں، اگر یہ ممکن نہ ہو تو پانی میں بھگو کر الفاظ مٹا دیں، اور پانی کسی ادب کی جگہ ڈال دیں، جہاں لوگوں کے پاؤں نہ پڑیں۔

(آپ کے مسائل اور ان کا حل، ۸/ ۴۶۳)

طلبہ کا اساتذۂ کرام کو ہدیہ دینا

سوال: کیا اساتذہ کے لئے طلبۂ کرام کا دیا ہدیہ لینا اور اس کو استعمال کرنا جائز ہے؟

جواب: اساتذۂ کرام کے لئے ان کے ہدایا لینا اور استعمال کرنا درست ہے۔ (مستفاد از: فتاویٰ محمودیہ: ۲۴/ ۱۷۴)

مدرسہ کے مدرس کو نوکر (ملازم) کہنا

سوال: کیا کسی دینی مکتب و مدرسہ کے مدرس کو مزدور یا نوکر یا ملازم کہہ سکتے ہیں؟ اور اگر کوئی کہتا ہے تو وہ کیسا ہے؟

جواب: دینی معلم و مدرس کا منصب بہت باعزت اور اعلیٰ منصب ہے، ایسے شخص کو مزدور یا نوکر کہنا اس کی توہین ہے، اور دوسری طرف معلم و مدرس کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے منصب کے لحاظ سے باوقار و مستغنی ہو کر رہے کہ اس کا مقصد خدمت دین ہے نہ کہ تحصیل زر اور نوکری۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۲۴/ ۲۵۰)

بیوی کا شوہر کی اجازت کے بغیر اپنی ماں کے گھر جانا

سوال: بیوی کا شوہر کی اجازت کے بغیر اپنی ماں کے گھر جانا کیسا ہے؟ اگر کوئی چلی جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟

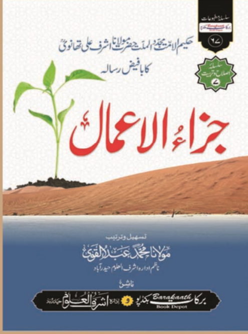
جواب: بیوی کا شوہر کی اجازت کے بغیر اپنی ماں کے گھر جانا درست نہیں ہے، اگر کوئی عورت چلی جائے تو اسے چاہیے کہ وہ شوہر کے گھر آ کر معافی مانگے، جب تک واپس نہیں آئے گی، نان و نفقہ شوہر سے پانے کی حق دار نہیں ہوگی۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۲۴/ ۲۷۴)

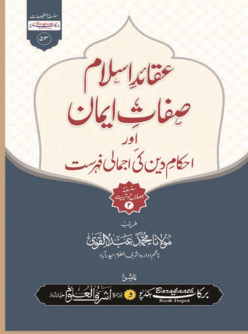
چھینک پر ''الحمد للہ رب العلمین'' کہنا

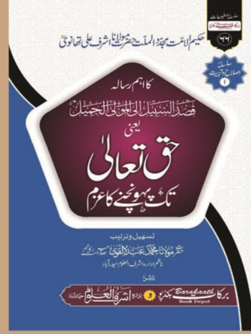
سوال: چھینک آنے پر ''الحمد للہ'' کہنے کے بجائے ''الحمد للہ رب العلمین'' کہنا کیسا ہے؟

جواب: صرف ''الحمد للہ'' ہی کہنا ثابت ہے، اس پر اپنی طرف سے اضافہ کرنا اگرچہ دوسری جگہ موجود بھی ہو درست نہیں ہے، لہٰذا چھینک پر صرف ''الحمد للہ'' ہی کہا جائے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۲۴/ ۳۲۷)

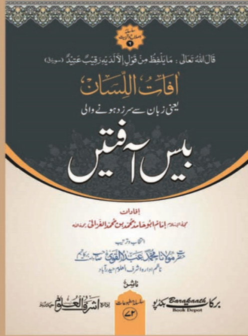
ASHRAFUL JARAID MONTHLY Rs20/-
RNI No: APURD/2007/24089 Postal. No: HSE/884/23-25
Date of Publication 3rd Sep-24, date of Posting 5th Sep-24

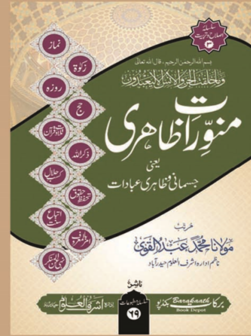


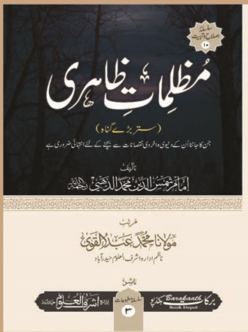


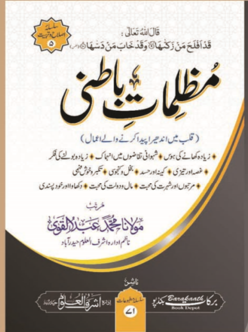


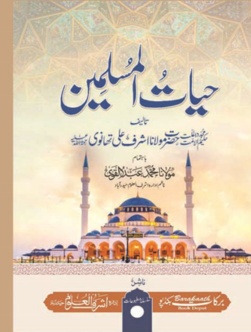












Printer, Publisher & Owner: Mohd Abdul Qavi, # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059
Published from: # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059
Editor : Mohammed Abdul Qavi. Printed at: Aish Offset Printers, Cellar Masjid-e-Meraj, Sayeedabad, Hyd-59